ہمارے ہیرے

CRSS

Center for Research & Security Studies

Rule of Law - Security - Governance

ہمارے ہیرے

ان انجان لوگوں کی سچی کہانیاں، جنہیں جاننا ان سے زیادہ ہمارے لئے ضروری ہے

یا بقول شاعر۔

مانا کہ ہم جہاں کو روشن نہ کر سکے

کانٹے تو کچھ ہٹا دیے گزرے جہاں سے ہم

تصنیف۔ شمس مومند

ادارت۔ ملک مصطفٰی

فہرست

عنوان	صفحہ نمبر
پس منظر	01
ابتدائیہ	03
اولسی پولیس ۔ ایک پراجیکٹ ایک تحریک	04
پولیس میں دیانت و شائستگی کا استعارہ ، محمد طاہر خان	06
انیلہ ناز کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی	08
موت کو شکست دینے کا استعارہ ۔ سید بخاری شاہ	10
صاحبزادہ سجاد کا صدارتی تمغہ	12
سوا سال میں ڈیڑھ کروڑ روپے کمائے مگر ۔ انسپکٹر رشید خان	14
ہم نے ٹیکنالوجی کے ذریعے پولیسنگ کا نظریہ تبدیل کر دیا ، اسفندیار	16
اسم بامسمیٰ ، رافعہ قسیم بیگ	18
خطروں کے کھلاڑی ۔ زاہد خان	20
تین بہنیں تین کمانڈو تین سہیلیاں	22
اولسی پولیس پروگرام نے زندگی کا دھارا بدل دیا ۔ باجی	24
حسنا خان کی خواہش	26
ایک عالم باعمل ۔ پروفیسر غلام رحمانی	27
ضمیر کی آواز۔ ارشد منان یوسفزئی	29
شہیدوں کا وارث ۔ غازی محمد فیاض ، ڈی ایس پی	31
کرپشن کے ماحول میں انٹی کرپشن آفیسر ، شفیع اللہ گنڈاپور	33
پولیس والے کی سماجی زندگی نہیں ہوتی ۔ DSP فضل واحد	35
SHO اعجاز کی کہانی یا ایڈونچر فلم	36
پولیس حقوق العباد کا ذریعہ ، ثمینہ ظفر بخاری	39
پولیس عوام سے اور عوام پولیس سے ہیں ۔ سجاد حسین	41

پس منظر

دنیا کا ہر معاشرہ ایک ساتھ اچھے برے لوگوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ ماہرین اس بات پر متفق ہے کہ بدترین نظر آنے والے معاشروں میں بھی برے لوگوں کی تعداد کم اور اچھے لوگوں کی زیادہ ہوتی ہے مگر اکثریت کے باوجود اچھے لوگ اس لئے نظر نہیں آتے ہیں کیونکہ ہم ان کی اچھائیوں کی تعریف نہیں کرتے جبکہ ایسا کرنے سے وہ مزید اچھا کرنے پر آمادہ ہوسکتے ہیں دوسری طرف برے لوگوں کا بار بار ذکر (بقول شاعر۔۔بدنام جو ہونگے تو کیا نام نہ ہوگا) انہیں نہ صرف مزید برائیوں پر اکساتا ہے بلکہ ایسا کرنے سے پورا معاشرہ برا اور اس کا چہرہ داغدار نظر آتا ہے۔ بعینہ یہی حال خیبر پختونخوا میں محکمہ پولیس کا بھی ہے کہ اس میں ہزاروں اچھے لوگوں اور بہت کچھ اچھا ہونے کے باوجود بظاہر اس کی برائیاں ہی دیکھی جاتی ہیں۔

عوام اور پولیس کے مابین گہرا تعلق اور اعتماد کا رشتہ ہی ایک پرامن معاشرے کا ضامن ہوتا ہے مگر پاکستان میں تھانہ کلچر، سیاسی مداخلت، رشوت، سفارش اور پیشہ ورانہ مہارت کی کمی نے محکمہ پولیس کو عوام کی نظروں میں بدنام کر کے رکھ دیا ہے اور شریف شہری اپنے جائز کام کے لئے بھی تھانے جانے اور رپورٹ درج کروانے سے کتراتے ہیں کہ کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ عوامی خدمت کا ادارہ ایک جابر فورس کی شکل اختیار کر کے عوام سے دور ہوتا گیا جس کی وجہ سے عوام اور پولیس میں نہ صرف فاصلے بڑھ گئے بلکہ دونوں کے درمیان اعتماد کا فقدان بھی پیدا ہوگیا۔

اگرچہ خیبر پختونخوا میں پولیس کا کردار تاریخی اور روایتی طور پر باقی صوبوں سے کافی بہتر اور دوستانہ تھا مگر دہشت گردی کے خلاف فرنٹ لائن صوبہ اور آسان ہدف ہونے کی وجہ سے پختونخوا پولیس نے انتہائی مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے اگر ایک طرف قربانیوں کی ایک لازوال داستان رقم کی تو دوسری طرف خطرات سے بچتے بچاتے عوام سے بھی دور ہوتی گئی۔

سابق آئی جی پی خیبر پختونخوا جناب ناصر درانی نے حالات کا بروقت ادراک کیا۔انھوں نے عوام اور پولیس کا رشتہ از سرنو مرتب کرنے اور اعتماد بڑھانے کے لئے بڑے پیمانے پر اصلاحات متعارف کرائیں۔

درج بالا حقائق اور اصلاحات کا تفصیلی ذکر سابق آئی جی نے 2017 میں شائع ہونے والی پختونخوا پولیس کی کتاب COP (Capacitating Force,Obstructing Millitants & Promoting Public Trust) میں بھی کیا ہے، جس میں آپریشنل خودمختاری، ہرسطح پر احتساب اور شفافیت، سیاسی مداخلت سے آزادی، پیشہ ورانہ تربیت، میرٹ کی بالادستی اور جدید سائنسی آلات کی فراہمی شامل ہیں۔سونے پر سہاگہ یہ کہ انہی کی کوششوں سے صوبائی حکومت نے درج بالا تمام اصلاحات کو پولیس ایکٹ 2017 کے ذریعے تحفظ فراہم کیا۔ان اصلاحات میں ڈی آر سی، ماڈل پولیس سٹیشن، احتساب کا شفاف اندرونی نظام، پال، پاز، آئی وی ایس، وی وی ایس، سی آر وی ایس اور تربیت کے سپیشلائزڈ سکول وغیرہ بھی شامل ہیں۔

ان تمام کوششوں کے باوجود عوام کی ایک بڑی تعداد ان اصلاحات سے بے خبر اور اپنے حقوق اور ان فوائد سے محروم تھی جس کی ضمانت آئین وقانون میں موجود ہے۔ یہ وہ وقت تھا جب سینٹر فار ریسرچ اینڈ سیکیورٹی سٹڈیز (سی آر ایس ایس) نے اولسی پولیس کے نام سے

ایک ایسا منصوبہ شروع کیا جس کے ذریعے عوام کو ان تمام اصلاحات سے آگاہ کر کے مستفید ہونے کا موقع فراہم کیا گیا۔اس منصوبے کا بنیادی مقصد عوام اور پولیس کو ایک دوسرے کے قریب لا کر قیام امن میں اپنا کردار ادا کرنا تھا۔ان مقاصد کے حصول کے لئے اٹھائے گئے اقدامات کی تفصیلات آگے آئے گی۔

ابتدائیہ

اگر چہ یہ ایک بہت روایتی جملہ ہے کہ میں بچپن سے لکھنے پڑھنے کا شوقین تھا، لیکن میرے حوالے سے اس کی سچائی کا اندازہ اس بات سے بآسانی لگایا جاسکتا ہے کہ فرسٹ ائیر میں اپنے کالج میگزین کا نہ صرف سٹوڈنٹ ایڈیٹر بنا بلکہ اپنا پہلا پشتو افسانہ (کوژدن کڑے) بھی لکھ کر شائع کیا۔ وہ دن اور آج کا دن، شعروادب کے علاوہ سفرنامہ نگاری، تاریخ نگاری، کالم نگاری، ٹی وی اور ریڈیو شوز کی میزبانی سمیت متعدد اصناف میں طبع آزمائی زندگی کا بہترین مشغلہ بن گیا۔

سی آر ایس ایس کے مختلف ریڈیو اور ٹی وی پروگراموں سمیت دیگر منصوبوں کے ساتھ چھ سالہ وابستگی نے میری صلاحیتوں کو جلا بخشی۔ انہی پروگراموں نے مجھے ایسے سینکڑوں خواتین وحضرات سے آشنا کروایا، جو اندھیری رات جیسے معاشرے میں جگنوؤں کی مانند اپنے حصے کی روشنی پھیلانے میں مصروف عمل ہیں۔ یہی وہ انجان لوگ ہیں جنہیں جاننا ان سے زیادہ ہمارے لئے ضروری ہے، کیونکہ یہ معاشرے سے لینے کی بجائے دینے پر یقین رکھتے ہیں۔ ان میں سے بعض کا کردار اور کارکردگی ہمارے لئے مشعل راہ ہے تو بعض کی گفتار میں وہ خلوص، توانائی اور ضیاء ملتی ہے کہ اگر اسے اپنایا جائے تو ہمارا معاشرہ امن، ترقی اور خوشحالی کا نمونہ بن جائے۔

اس کتاب میں شامل تمام کہانیاں حقیقی ہیں، ان لوگوں کے انٹرویوز سے ماخوذ جن کے ساتھ سی آر ایس ایس کے اولسی پولیس پروگرام میں ہمارا واسطہ پڑا اور جنہیں میں تبدیلی کے پیامبر سمجھتا ہوں۔ البتہ ان کہانیوں کو قلم بند کرنے کے لئے راغب کرنے پر ایگزیکٹیو ڈائریکٹر سی آر ایس ایس جناب امتیاز گل صاحب کا بے حد ممنون ہوں جنھوں نے موضوع کے انتخاب میں میری رہنمائی فرمائی۔ انھوں نے نہ صرف یہ کتابچہ لکھنے کی ہدایت کی بلکہ اسے سی آر ایس ایس کی جانب سے شائع ہونے کی ذمہ داری بھی لے لی۔ اگر اس کتابچے کے پڑھنے والوں میں سے چند لوگ بھی کسی کہانی سے متاثر ہوکر کچھ مثبت کرنے پر آمادہ ہوئے تو سمجھو پورا سی آر ایس ایس اپنے مقصد میں کامیاب ہوگیا۔

یوم شہدا پولیس کی مناسبت سے اگست کے مہینے میں اس کتاب کی اشاعت ان پولیس شہدا کو سی آر ایس ایس کی جانب سے نذرانہ عقیدت ہے جنھوں نے اپنی قیمتی جانوں کے نذرانے دیکر اپنے محکمے کے دامن پر حرف نہیں آنے دیا۔ یہ دو اشعار انہی شہدا کے نام۔۔

ہم سے ہمارے چاہنے والے بچھڑ گئے
اب انکی قربتوں کے زمانے گزر گئے
جنکی رفاقتوں کو نہ بھولے گا دل کبھی
تنہا ہمیں وہ چھوڑ کر جانے کدھر گئے

فقط خیر اندیش
شمس مومند
اگست دو ہزار اٹھارہ

اولسی پولیس۔ ایک پراجیکٹ ایک تحریک

یوں تو سی آر ایس ایس کا ہر ایک پراجیکٹ اپنی مثال آپ ہوتا ہے کیونکہ اس کے پیچھے اگر ایک طرف سی آر ایس ایس کے بانی وا یگزیکٹیو ڈائریکٹر امتیاز گل کے اچھوتے خیالات، رہنمائی اور کوششیں کارفرما ہوتی ہے تو دوسری جانب سی آر ایس ایس کے تمام کارکنوں کی شبانہ روز محنت اور مخلصانہ جدوجہد ہر پراجیکٹ کی کامیابی کی ضمانت بن جاتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ اگر ایک طرف سی آر ایس ایس کے ریڈیو پروگرام (صباوون) نے مسلسل ساتویں سال میں داخل ہوکر صوبے میں کامیابی کی نئی مثال قائم کی تو دوسری جانب مونگ قبائل ہو یا اولسی عدالت، دہ امن آواز، دہ کلی چارے، Harnessing Future Leaders (HFL)، ہو یا،اولسی تڑون، سب نے نہ صرف عوام سے کامیابی اور مقبولیت کی سند حاصل کی بلکہ ان پر گہرے نقوش بھی مرتب کئے۔

مگر جہاں تک اولسی پولیس پراجیکٹ کا تعلق ہے، اس کا نام اور آئڈیا ہی اتنا اہم، بروقت اور منفرد تھا کہ یہ شروع ہوتے ہی اپنے دائرہ کار (ٹارگٹ ایریا) سے نکل کر ایک تحریک بن گیا، اور آج صوبے کے کونے کونے میں جہاں بھی پولیس سے متعلق گفتگو ہوتی ہے تو یہ بات ضرور ہوتی ہے کہ اس کو اولسی پولیس بننا چاہیے یا یہ کہ نہ صرف پولیس کو عوام دوست بلکہ عوام کو بھی پولیس دوست ہونا چاہیئے۔ اور یہی اس پورے پراجیکٹ کا لب لباب ہے۔

اس پراجیکٹ کا اصل نام Ulasi Police - Strengthening Rule of Law in KP تھا جس میں پولیس اصلاحات کو مدنظر رکھ کر مختلف طریقوں سے خیبرپختونخوا کے تین اضلاع پشاور، چارسدہ اور مردان میں عوام اور پولیس کو ایک دوسرے کے قریب لانا تھا تاکہ عوام نہ صرف قانون کے مطابق اپنے حقوق کا مطالبہ کرسکیں بلکہ وہ پولیس اصلاحات سے مستفید بھی ہو۔اور اس کا حتمی نتیجہ قانون کی عملداری مضبوط کرنا تھا۔یعنی ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس پراجیکٹ کا اصل مقصد عوام اور پولیس کو ایک دوسرے کے قریب لاکر فاصلوں کو مٹانا اور اعتماد کو بڑھانا تھا۔اس مقصد کے لئے تینوں اضلاع میں سال بھر مختلف Activities کا ایک ٹائم ٹیبل ترتیب دیا گیا اور اس مرتبہ ٹائم ٹیبل پر امتحانی ٹائم ٹیبل سے زیادہ پابندی کے ساتھ عمل کیا گیا۔ان سرگرمیوں کا خلاصہ کچھ یوں ہے کہ پشاور اور مردان میں پختونخوا ریڈیو سے جبکہ چارسدہ میں معروف ریڈیو دلبر سے اولسی پولیس کے نام سے چالیس ریڈیو پروگرام براہ راست نشر کئے گئے۔ان ایک سوبیس پروگراموں میں کل 308 مہمانوں نے شرکت کی جس میں تقریبا 200 پولیس افسران شامل ہیں۔ان پروگراموں میں 1200 سننے والوں نے باقاعدہ ٹیلی فون کالز کرکے اپنی شرکت کو ثابت کیا،ان میں سے 653 افراد نے براہ راست اپنے مسائل خود پولیس افسران کو بیان کئے،اور پروگرام میں موجود افسران نے ان عوامی مسائل کو حل کرنے کی بھرپور کوشش کی۔

پراجیکٹ دورانئے میں عوام اور پولیس کے نام سے 10 ٹی وی پروگرام ریکارڈ کرکے PTV NEWS سے نشر کئے گئے،ان دس پروگراموں میں کل 223 افراد نے شرکت کی جس میں اس وقت کے IGP ناصر درانی سے لیکر Acting IGP سید اختر علی شاہ

سمیت 31 اعلی افسران اور تجزیہ کاروں نے موضوعات کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا جبکہ 192 طلباء و طالبات نے شوز میں شرکت کر کے سوالات اٹھائے اور مہمانوں نے ان کے جوابات دے کر فاصلے مٹانے کی کوشش کی۔

تیسری سرگرمی کے طور پر ہر ضلع میں متعین وقفوں کے ساتھ چار چار مشاورتی اجلاس منعقد کئے گئے جس میں ہر ضلع کے آٹھ منتخب پولیس افسران، آٹھ چنے گئے عوامی نمائندوں کے ساتھ مشترکہ اجلاس میں شرکت کرتے اور پولیس اصلاحات کے مختلف پہلوؤں، ان کی خوبیوں اور خامیوں پر سیر حاصل گفتگو ہوتی، انہی مشترکہ اجلاسوں میں ریڈیو پروگراموں کے لئے موضوعات کا انتخاب بھی کیا جاتا تھا۔

اولسی پولیس پراجیکٹ کی ایک اور اہم سرگرمی ہر ضلع میں چار چار پبلک فورم کا انعقاد تھا۔ یہ تمام فورم انتہائی عوامی مقامات یعنی پریس کلب اور کمیونٹی ہالز میں منعقد کئے گئے جس میں اگر ایک طرف 80 سے 100 تک مختلف طبقہ فکر کے افراد کی شرکت کو یقینی بنایا گیا تو دوسری طرف AIG، DIG لیول کے پولیس افسران اور صوبائی وزرا کو عوام کے سامنے بٹھانے اور ان کے تند و تیز سوالوں کے جوابات دینے پر آمادہ کیا گیا۔ جس سے عوام اور پولیس کے درمیان فاصلے مٹانے میں یقیناً مدد ملی۔ تین اضلاع کے ان بارہ پبلک فورمز میں کل 1100 افراد نے براہ راست شرکت کر کے پولیس اصلاحات کے متعلق آگہی حاصل کی۔

اولسی پولیس کی ٹیم نے مختلف قومی اخبارات میں لکھنے والے کالم نویس دوستوں کو متحرک کر کے انہیں پولیس اصلاحات سے متعلق لکھنے پر آمادہ کیا اور ایک سالہ دورانئے میں ان موضوعات پر بیس سے زیادہ کالمز لکھ کر شائع ہوئے جس نے یقیناً لاکھوں قارئین تک پیغام پہنچانے میں اہم کردار ادا کیا۔

مختصر یہ کہ ایک سال دورانئے کی مختلف اولسی پولیس سرگرمیوں سے 3300 افراد نے براہ راست فائدہ اٹھایا جبکہ تین ریڈیو سٹیشنز کے ہزاروں سامعین، پاکستان سمیت دنیا بھر میں پی ٹی وی کے لاکھوں ناظرین اور پندرہ اخبارات کے لاکھوں قارئین بالواسطہ طور پر ہمارے پیغام سے آگاہ ہوئے۔ جس کے دوررس اثرات ظاہر ہونا شروع ہوگئے ہیں۔ اللہ ہم سب کو مزید بہتر کام کرنے کی توفیق دے۔

پولیس میں دیانت و شائستگی کا استعارہ، محمد طاہر خان

محمد طاہر خان بیس منٹ تک فی البدیہہ بولتے رہے۔حاضرین ٹکٹکی باندھے ان کا ایک ایک لفظ سننے کے لئے ہمہ تن گوش تھے۔انھوں نے پولیس اصلاحات کا پس منظر، وجوہات، اقسام، اہمیت اور فوائد پر وہ سیر حاصل تقریر کی کہ مجھ سمیت تمام حاضرین دم بخود رہ گئے، اور جب انھوں نے تقریر ختم کی تو حاضرین اتنی دیر تک تالیاں بجاتے رہے گویا انھوں نے تقریر کے دوران تالیاں بجا کر تقریر کی روانی کو توڑنا مناسب نہیں سمجھا تھا اور اب وہ اس کا ازالہ کرنا چاہتے تھے۔یہ مردان پریس کلب میں منعقدہ اولسی پولیس کا پبلک فورم تھا جس میں محمد طاہر خان (اس وقت ڈی آئی جی مردان) بحثیت مہمان خصوصی خطاب کر رہے تھے۔تقریر کے بعد سوال و جواب کا مرحلہ شروع ہوا۔اس میں بھی محمد طاہر خان نے اپنے الفاظ کے چناو، مدلل جوابات اور بھرپور معلومات سے حاضرین کے دل جیت لئے۔وہ دن اور آج کا دن میں نے جب بھی طاہر خان سے بزریعہ ٹیلی فون یا براہ راست گفتگو کی ہے میں دل ہی دل میں ان کی برجستگی اور شائستگی کی داد دئے بغیر نہیں رہ سکا ہوں، حالانکہ اس کے بعد وہ سی سی پی پشاور جیسے انتہائی کھٹن، ہمہ وقت مصروف اور انتہائی بھاری ذمہ داری کی پوسٹ پر تعینات رہے،اس کے باوجود نہ انکی مسکراہٹ ماند پڑی نہ ہی انکی شائستگی میں کمی آئی، کیونکہ وہ اپنے ایک ایک لمحے کو ضرورت کے مطابق استعمال کرنے کا فن بخوبی جانتا ہے جو کسی بھی لیڈر کی بڑی خوبی تصور کی جاتی ہے۔

محمد طاہر خان کا تعلق ضلع چارسدہ سے ہے، کچھ اس زرخیز و مردم خیز خطے کا اثر اور کچھ اپنی خداداد صلاحیتوں کا کمال، طاہر خان سکول سے لیکر یونیورسٹی اور پھر پولیس ٹریننگ میں ہمیشہ صف اول میں رہے، انٹرمیڈیٹ میں پورے صوبے کو ٹاپ کر کے گولڈ میڈل حاصل کیا، مسلسل ایڈورڈ کالج کے ٹاپر رہے، سی ایس ایس کے بعد پولیس میں شمولیت اختیار کی تو اپنے چھبیسویں بیچ کو ٹاپ کر کے تمغے کے حقدار ٹھرے، لندن سے HRM کی ڈگری لی اور امریکہ میں فل برائٹ سکالرشپ حاصل کرنے میں کامیاب رہے۔اپنی محنت مشقت اور دیانت کی بدولت قائداعظم پولیس میڈل سے نوازا گیا۔اور ان کی کامیابیوں کا سلسلہ ابھی جاری ہے۔آج کل ڈی آئی جی سپیشل برانچ کے عہدے پر تعینات ہیں۔

محمد طاہر خان انیس سو ننانوے میں پولیس میں شمولیت اختیار کی، پانچ سال موٹروے پولیس میں اپنی دیانت اور شائستگی منتقل کرتے رہے، اس کے علاوہ نوشہرہ، مردان چارسدہ اور بنوں میں ڈی ایس پی سے لیکر ڈی آئی جی تک عہدوں پر تعینات رہے۔پشاور کے لئے

دہشت گردی کے سب سے کھٹن دور دو ہزار سات آٹھ میں ایس ایس پی آپریشن کے مشکل ترین عہدے پر فائز رہے، اس دور کو یاد کرکے ہنستے ہوئے کہا کہ ان دنوں صبح سے شام تک فیلڈ میں دھماکوں، پولیس پر حملوں اور جوابی کارروائیوں میں مصروف رہتے، شام سے رات بارہ بجے تک دفتری امور نمٹاتے اور جب بارہ بجے گھر پہنچ جاتے، تو اکثر ٹیلی فون پر ضروری معلومات کے حصول اور اعلیٰ حکام سے بات چیت میں صبح ہو جاتی۔

ایک سوال کے جواب میں محمد طاہر خان نے بتایا کہ صفوت غیور کی شہادت ایک ایسا واقعہ ہے جسے میں زندگی بھر بھلا نہیں سکتا، کیونکہ وہ پولیس میں کارکردگی اور تبدیلی کے پیامبر تھے۔ ان سے پہلے پولیس نوکری لکیر کے فقیر اور ٹائم پاس پالیسی تک محدود تھی، صفوت غیور نے روایات سے بغاوت کی، انھوں نے کم وقت میں وہ سب کچھ کر دکھایا جو دنیا کے ترقیافتہ ممالک میں کسی بھی پولیس آفیسر کے لئے ممکن ہو سکتا ہے۔ صفوت غیور کی تعریف کرتے ہوئے طاہر خان کی آنکھیں دور خلاوں میں ان کو ڈھونڈتی رہی، ان کی آواز مدھم پڑ گئی جیسے وہ خود کلامی کر رہے ہوں۔ میں نے صرف اتنا سنا، کاش وہ چند سال اور زندہ رہتے۔

انیلہ ناز کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی

یہ اپریل انیس سو چھیانوے کی ایک خوشگوار صبح تھی جب میں اے ایس آئی بھرتی ہونے کے بعد پہلی مرتبہ اپنے دفتر میں داخل ہو رہی تھی۔ دفتر کے باہر بینچ پر بیٹھا ایک باوردی شخص اٹھ کر میرے احترام میں کھڑا ہو گیا۔ پختونخوا کے پسماندہ جنوبی ضلع کرک کی ایک دیہاتی لڑکی کو پہلی مرتبہ اپنی اہمیت اور مرتبے کا احساس ہوا، کیونکہ ابھی تک میں نے صرف خواتین اور خاص کر لڑکیوں کو مردوں کے احترام میں اٹھتے ہوئے دیکھا تھا۔ پہلی مرتبہ جب میں نے دیکھا کہ ایک خاصا بارعب اور باوردی شخص میرے احترام میں اٹھا تو میرا سر فخر سے بلند ہوا، مجھے اپنے والد کے خوابوں کی تعبیر نظر آنے لگی۔ یہ میرے والد کا خواب تھا کہ ان کے پانچ بچوں میں سے کوئی ایک پولیس آفیسر بنے۔ یہی وجہ ہے کہ پولیس فورس میں بھرتی ہونے سے چند ماہ پہلے، میں ائیر پورٹ سیکیورٹی فورس اور محکمہ تعلیم کی نوکریاں ٹھکرا چکی تھی۔ وہ دن اور آج کا دن، اگر ایک طرف میں نے پولیس میں اپنی ذمہ داریوں کو فرض عین سمجھ کر نبھایا ہے، تو دوسری جانب پولیس کے جوانوں سمیت افسران نے بھی مجھے عزت وتوقیر دینے میں بخل سے کام نہیں لیا ہے۔

اگرچہ آج کی نسبت نوے کی دہائی میں خواتین کی حوصلہ افزائی کافی کم تھی، مگر زیادہ مشکل اس لئے نہیں ہوئی کہ ایک تو مجھے والد کا بھرپور تعاون حاصل رہا ثانیاً یہ کہ میں شوق اور لگن سے کچھ کرنا چاہتی تھی، یہی وجہ تھی کہ ایک سال کا ابتدائی کورس مکمل کرنے کے بعد مزید آگے بڑھنے کے لئے میری جستجو جاری رہی۔ چھ مہینے کا اپر کورس مکمل کیا، تین مہینے کا ایڈوانس کورس کیا، اور جب سے پولیس اصلاحات کے ذریعے شارٹ کورس متعارف کئے گئے ہیں، میں نے کوئی کورس نہیں چھوڑا۔ انوسٹی گیشن سے لیکر بم ڈسپوزل تک، میں نے تمام مہارتیں حاصل کی ہیں۔

انیلہ ناز کے مطابق ابتدا میں چھاپے مارنے میں ہچکچاہٹ اور مشکلات محسوس ہو رہی تھی، کیونکہ دسمبر کی سردی تھی، رات دو اور تین بجے ہاسٹل میں کال آتی تھی کہ چھاپہ مارنے کے لئے اتنی لیڈی فورس چاہیے۔ جاڑے کی سردی، جوانی کی کچی نیند سے بیداری، فوری تیاری اور سب سے بڑھ کر چھاپہ مارنے جیسے خطرناک کھیل میں کودنا بچوں کا کھیل نہیں تھا۔ لیکن یہ سب کچھ خندہ پیشانی سے برداشت کر کے میں نے ثابت کیا کہ آج کی خواتین کسی بھی میدان میں مردوں سے کم نہیں۔

انیلہ ناز کا کہنا تھا کہ بیس سال کا عرصہ پلک جھپکتے گزر گیا۔ اور آج میں ڈی ایس پی ٹریننگ جیسے نسبتا آسان اور قابل احترام پوزیشن پر تعینات ہوں اور ابھی دل میں بہت کچھ کرنے کا جذبہ ہے خاص کر ان بے آسرا خواتین کے لئے، جو مردوں کے ساتھ کام کرنا تو درکنار ان سے بات کرنے سے بھی ڈرتی ہیں۔ میں انہیں ایک رول ماڈل کے طور پر پیغام دیتی ہوں کہ آئیے اور مردوں کے شانہ بشانہ کام کر کے ثابت کریں کہ اگر جذبہ سچا اور کچھ کرنے کی لگن ہو، تو منزل تک پہنچنا مشکل صحیح، ناممکن بالکل نہیں۔

موت کو شکست دینے کا استعارہ ۔سید بخاری شاہ

ملک وقوم پر قربان ہونا میری آخری خواہش ہے مگر شاید ابھی تک اللہ کو یہ بھی منظور نہیں ۔کیونکہ ایک درجن سے زیادہ دہشت گرد حملوں اور دھماکوں میں نشانہ بننے کے باوجود آج بھی زندہ ہوں ۔ یہ بات کہتے ہوئے اسسٹنٹ سب انسپکٹر سید بخاری شاہ کی آواز بھرا گئی ۔ دہشت گردی کے خلاف جنگ میں تقریباً پندرہ سال تک فرنٹ لائن پر ڈیوٹی انجام دینے والے سید بخاری شاہ کا تعلق چارسدہ کے علاقے ترنگزئی سے ہے۔

آٹھ بچوں کے باپ ہونے کے باوجود بچوں سے بے نیاز سید بخاری شاہ گزشتہ پندرہ سال سے پشاور کے مضافات میں واقع متنی، بڈھ بیر اور سربند میں فرائض انجام دے رہے ہیں۔ دہشت گردوں کے لئے سب سے آسان ہدف کے طور پر یہ وہ علاقے ہیں جہاں تین سال تک تقریباً روزانہ کی بنیاد پر حملے اور دھماکے ہوتے رہے ہیں۔ بخاری شاہ پہلی مرتبہ اکتوبر دو ہزار بارہ میں متنئی کے علاقے میں دہشت گردوں کے ساتھ مقابلے میں شدید زخمی ہوئے ،انہیں دس گولیاں لگی تھیں، سر سے پاوں تک وہ اصطلاحاً نہیں عملاً چھلنی تھے۔ ۔ کمزور ونحیف جسم کے باوجود چھ مہینے تک ہسپتال میں زیر علاج رہ کر موت سے مقابلہ کیا اور اپنی مضبوط قوت ارادی سے جیت کر دکھایا۔روبصحت ہوئے تو طویل چھٹی کی بجائے اسی تھانے میں ادائے فرض کے لئے پہنچ گئے۔

دو ہزار چودہ میں اس کو ایک مرتبہ پھر سربند کے علاقے میں بکتر بند گاڑی میں گشت کرتے ہوئے خودکش دھماکے کا نشانہ بنایا گیا۔مگر قسمت کے دھنی بخاری شاہ قبرستان کی بجائے پھر ہسپتال پہنچ گئے۔اور ہسپتال سے کچھ ہی عرصے بعد ایک مرتبہ پھر اسی تھانے پہنچ کر دہشت گردوں کو پیغام دیا کہ۔

ع   مدعی لاکھ برا چاہے تو کیا ہوتا ہے
وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے

بیوی ناراض رہی، بچے منتیں کرتے رہے، والدین رشتہ دار دباوڈالتے رہے کہ کسی پرامن جگہ تبادلہ کروالو، اگر نہیں ہوتا ہے تو نوکری چھوڑ دو، کیونکہ نوکری زندگی سے پیاری نہیں، مگر سید بخاری شاہ یہ کہہ کر سب کے منہ بند کرتے رہے کہ بحیثیت مسلمان ہمارا ایمان ہے کہ (دہ گور شپہ پہ کور نشی کیدے) یعنی موت کے لئے ایک وقت مقرر ہے وہ اس سے نہ پہلے آسکتی ہے نہ بعد میں۔

ایک سال بعد وہ ایک اور دھماکے میں تیسری مرتبہ زخمی ہوکر ہسپتال پہنچ گئے اور چند دن بعد دوبارہ ڈیوٹی پر۔ دھماکوں اور حملوں کا یہ نہ ختم ہونے والا سلسلہ آج تک جاری ہے۔ بخاری شاہ کا کہنا ہے کہ گزشتہ پندرہ سال کے دوران مجھ پر ڈیوٹی کے دوران اتنے حملے ہوئے ہیں کہ اب میں نے ان کو گننا ہی چھوڑ دیا ہے۔ فرض شناسی جرات اور بہادری کا یہ بے مثال نمونہ پختونخوا پولیس کے ماتھے کا جھومر ہے مگر افسوس کہ ایسے بہادر سپوت کو نہ کوئی ایوارڈ دیا گیا ہے نہ کوئی انعام، باقی انعام و اکرام تو درکنار، محکمے نے آپکو دوران علاج تیس ہزار روپے دئے تھے جو بعد میں ان کی تنخواہ سے واپس کاٹ دئے گئے۔ پانچ سال ہوئے سب انسپکٹر کے عہدے پر ترقی کے بیج لگائے ہوئے مگر تنخواہ وہی پرانی۔ ایسے انمول ہیرے کی بے قدری کر کے ہم کیا یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ ہم مردم شناس نہیں، ہم اپنے ہیروں کی قدر نہیں کرتے۔ اگر ایسا نہیں ہے اور خدا کرے کہ ایسا کسی غلطی سے ہوا ہو، ارادتاً نہیں، تو اب بھی موقع ہے کہ ان کی حوصلہ افزائی کی جائے، انہیں انعام و اکرام سے نواز کر قوم پر ان کے احسانات کا بدلہ چکا دیا جائے۔ ورنہ اغیار یہ کہنے میں حق بجانب ہونگے کہ ہم پاکستانی مردہ پرست قوم ہیں صرف اپنے شہیدوں کو بعد از مرگ نوازنے میں سخاوت سے کام لیتے ہیں زندہ ہیروں کی ہمارے ہاں کوئی قدر نہیں۔

صاحبزادہ سجاد کا صدارتی تمغہ

اسلامیہ کالج کے بانی اور سابق وزیر اعلیٰ صوبہ سرحد (خیبر پختونخوا) صاحبزادہ عبدالقیوم کے خاندان میں پیدا ہونے والے صاحبزادہ سجاد احمد پیدائشی طور پر نفیس اور متوازن شخصیت کے مالک ہیں صاحبزادہ خاندان کا صوبے کی تعلیم، سیاست اور ترقی میں ہمیشہ سے اہم کردار رہا ہے، قیام پاکستان سے لیکر آج تک ہر دور میں اس خاندان کے افراد انتہائی ناموری کے ساتھ ان میدانوں میں سر فہرست رہے ہیں۔ خاندان کے اسی قابل احترام تسلسل کو برقرار رکھتے ہوئے صاحبزادہ سجاد نے ایک جذبے کے ساتھ انیس سو پچانوے میں کمیشن کے ذریعے اسسٹنٹ سب انسپکٹر کے طور پر پولیس میں شمولیت اختیار کی۔

اب یہ ان کی خوش قسمتی تھی یا موٹروے پولیس کی کہ ان دنوں موٹروے پولیس کی بنیاد رکھی جا رہی تھی۔ افسران بالا نے صاحبزادہ سجاد کی ذوق اور صلاحیتوں کو مد نظر رکھ کر ان کی خدمات موٹر وے پولیس کے حوالے کیں جہاں تین سال تک انھوں نے ڈیپوٹیشن پر خدمات انجام دیں۔ آج جب موٹروے پولیس کو ایک ماڈل فورس کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے تو اس میں صاحبزادہ سجاد کا پسینہ بھی شامل ہے۔

موٹروے پولیس میں آوٹ سٹینڈنگ کارکردگی پر اس وقت کے صدر پاکستان جنرل پرویز مشرف نے آپ کو تعریفی سرٹیفیکیٹ سمیت نقد انعام سے بھی نوازا۔

اپنی سروس کے دوران انہیں دو مرتبہ برطانیہ میں تعلیم و تربیت کے لئے جانے اور وہاں کا پولیس نظام قریب سے دیکھنے اور اس سے سیکھنے کا بھی موقع ملا، جس نے ان کی صلاحیتوں کو مزید نکھارنے میں اہم کردار ادا کیا۔

پشاور، مردان، نوشہرہ اور ڈی آئی خان کے مختلف تھانوں میں بحیثیت ایس ایچ او خدمات کے بعد انہیں دو ہزار دس میں ڈی ایس پی کے عہدے پر ترقی دی گئی۔ یہ وہ ایام تھے جب دہشت گرد پشاور کے دروازے پر دستک دے رہے تھے۔ آپ کو اسی دروازے (متنئی بڈھ بیر) میں تعینات کیا گیا لیکن جس طرح کہا جاتا ہے کہ ہمت مرداں مدد خدا، آپ نے اپنی پوسٹنگ کے دوران دہشت گردوں کے سامنے سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن کر ثابت کیا کہ بندہ حب وطن کے جذبے سے سرشار اور جذبہ جواں ہو تو طاقتور سے طاقتور دشمن بھی شکست نہیں دے سکتا ہے۔ یہاں مختلف واقعات میں صاحبزادہ سجاد نے اپنی بہادری اور مہارت کے جوہر دکھائے اور پہلے کی نسبت زیادہ لگن کے ساتھ اپنے کام کو جاری رکھا۔

تین سال سے جاری پولیس اصلاحات کے نفاذ میں بھی صاحبزادہ سجاد نے اپنا حصہ خوب ڈالا ہے۔ بحیثیت ڈی ایس پی ٹریفک، پشاور میں ٹریفک کے اژدھام کو کنٹرول کرنے کے لئے ٹریفک وارڈن سسٹم کا اجرا، محکمے میں ڈرائیونگ سکول کا قیام اور ٹریفک کی روانی بہتر بنانے کے لئے یوٹرن کا خاتمہ ان کی خدمات ہیں جس سے لاکھوں لوگ روزانہ مستفید ہو رہے ہیں۔

صاحبزادہ سجاد آج کل ایس پی سیکورٹی کے طور پر خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اولسی پولیس کے پلیٹ فارم پر اظہار خیال کرتے ہوئے

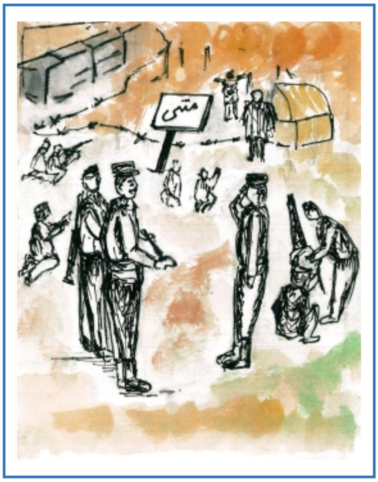

آپ کا کہنا تھا کہ کسی شہر کے باسیوں کی تہذیب وتمدن کا آسان پیمانہ وہاں کا ٹریفک نظام ہوتا ہے۔اگر ہم مہذب لوگ ہیں تو ہمیں ٹریفک قوانین کی پاسداری کرنی ہوگی۔سرکاری اداروں کی ترقی کے لئے ان کی خواہش ہے کہ ایک تو ان میں سے دیانت دار اور محنتی لوگوں کی قربانیوں کی قدر کی جائے اور ثانیا یہ کہ سرکاری ملازمین دوران ڈیوٹی ذاتی کاموں سے گریز کریں۔ہم اداروں کی کمزوری اور ترقی پزیری کے جس دور سے گزر رہے ہیں ہمیں دن میں آٹھ گھنٹے کی بجائے پندرہ گھنٹے کام کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ یہ ملک کسی اور نے نہیں ہم ہی نے آگے لے کے جانا ہے۔جس کا واحد طریقہ محنت اور دیانت داری ہے۔

سوا سال میں ڈیڑھ کروڑ روپے کمائے مگر ۔ انسپکٹر رشید خان

شاعر فرماتے ہیں ع۔ طوفاں میں لاکے رکھ دیا گھر کے چراغ کو
اپنے خدا پہ ہم کو بھی کتنا یقین تھا

بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے کا محاورہ تو سنا تھا مگر بہتی گنگا کے کنارے پیاس کا روزہ رکھنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں، یہ صرف ان خوددار و دیانت دار لوگوں کا کمال ہوسکتا ہے جنہیں اپنے خدا پر اتنا ہی کامل یقین ہو جتنا درجہ بالا شعر میں شاعر کو ہے۔ پشاور میں بدنام زمانہ ٹریفک کے محکمے میں انسپکٹر رشید خان کو بھی اللہ تعالی پر اتنا ہی یقین کامل ہے، اس لئے قانون کی عملداری یقینی بنانے کے لئے وہ نہ کسی افسر کا لحاظ رکھتے ہیں نہ کسی امیر کبیر کا اور نہ کسی وزیر مشیر کا، یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ٹریفک پولیس پشاور میں کام کرتے ہوئے صرف پندرہ مہینے میں 28380 افراد کے چالان کئے یعنی ان پر جرمانے عائد کئے اور اس طرح انھوں نے ٹریفک وارڈن کی حیثیت سے کام کرتے ہوئے صرف سوا سال میں ڈیڑھ کروڑ روپے کمائے مگر اپنی ذات کے لئے نہیں سرکاری خزانے کے لئے، جرمانہ بھرنے والوں کی اس فہرست میں 29 تو ایسے VIP بھی شامل ہیں جس کو میڈیا میں بھی باقاعدہ اچھالا گیا۔ اس پر اداریے لکھے گئے اور شہ سرخیاں لگائی گیں۔ اور بہت قلیل عرصے میں رشید خان جیسے لوگوں کی دیانت اور جرات کیوجہ سے ٹریفک کا بدنام زمانہ محکمہ عزت اور شہرت کمانے لگا، کیونکہ رشید خان کی ڈیوٹی کے دوران جو بھی ڈرائیور غلطی کا مرتکب ہوا، اسے اپنے کئے کی سزا بھگتنا پڑی۔

بقول شاعر۔

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا نہ کوئی بندہ نواز

مگر یہ انسپکٹر رشید خان کی زندگی کا صرف ایک رخ ہے، جس کی ہم جیسے سننے اور پڑھنے والے تعریف کرتے ہیں مگر جو لوگ ان کی گرفت میں آتے ہیں وہ اس پر ناک بوں بھی چڑھاتے ہیں، ان کی زندگی کا دوسرا رخ اتنا حسین ہے کہ اس پر کوئی بھی انسان ناک بوں چڑھانا تو درکنار اس پر انگلی تک نہیں اٹھا سکتا اور وہ ہے، رشید خان کا ایک سماجی اور فلاحی کارکن کی حیثیت سے خدمات۔ عام طور پر لوگ اپنے سرکاری حیثیت اور تعلقات کو ذاتی مفادات کے لئے استعمال کرتے ہیں، مگر رشید خان یہاں بھی انوکھا لاڈلا ہے، شاید ہزاروں میں ایک، وہ شخصیت جو اپنی سرکاری حیثیت اور تعلق کو یتیموں کی بھلائی کے لئے استعمال کر رہا ہے۔ انھوں نے اپنے فیس بک پیج کی مقبولیت اور تعلق کو مدنظر رکھ کر یتیموں کے مالی امداد کا فیصلہ کیا، مگر یہاں بھی چندہ جمع کرنے اور ڈونرز پر انحصار کرنے کی بجائے

شروعات اپنے آپ اور اپنے گھر سے کی۔ ابتدائی طور پر انھوں نے 5000 روپے اپنی تنخواہ سے کاٹے، چھ ہزار اپنی والدہ سے لئے اور تیس ہزار روپے اپنے بیرون ملک مزدوری کرنے والے تین بھائیوں سے اس مقصد کے لئے منگوائے، یہ 41000 روپے جب انھوں نے یتیموں میں بانٹنا شروع کئے تو یار دوستوں اور جاننے والے صاحب ثروت افراد نے بھی اس کار خیر میں اپنا حصہ ڈالا۔ رشید خان کا کہنا ہے کہ صرف ایک مہینے میں انھوں نے چارسدہ، مردان، صوابی، سوات اور بونیر کے چالیس خاندانوں میں دو لاکھ اڑسٹھ ہزار روپے تقسیم کئے۔ رشید خان کو پختہ یقین ہے کہ انشاءاللہ یہ سلسلہ نہ صرف جاری رہے گا بلکہ یہ مزید بڑھے گا۔

اس کار خیر میں شفافیت کو یقینی بنانے کے لئے انھوں نے کم خرچ بالانشین کے مصداق، اپنے موبائل کو استعمال کرنا شروع کر دیا ہے، یعنی جس یتیم کو بھی پانچ ہزار روپے دیتے ہیں اپنے موبائل سے اس کی باقاعدہ ویڈیو بنا کر اسے ریکارڈ کا حصہ بنا دیا جاتا ہے۔

رشید خان کا خیال ہے کہ ڈرائیورز کو باقاعدہ ٹریفک ایجوکیشن دینا اور اس کے باوجود اگر کوئی ٹریفک کی خلاف ورزی کرے تو بلاتفریق اس پر بھاری جرمانے عائد کرنا ٹریفک نظام کو بہتر بنانے میں کارگر ثابت ہوسکتا ہے۔ کاش ہم میں کئی ایک رشید خان ہوتے۔

ہم نے ٹیکنالوجی کے ذریعے پولیسنگ کا نظریہ تبدیل کردیا، اسفندیار

دوہزار بارہ سے پہلے خیبر پختونخوامیں پولیس، زور زبردستی، سخت رویے اور تشدد کا دوسرا نام تھا۔مگر آج پختونخوا پولیس انفارمیشن ٹیکنالوجی سے لیس پیشہ ور اور مہذب فورس کی علامت ہے۔ یہ خیالات محکمہ پولیس کے آئی ٹی برانچ میں کام کرنے والے اسسٹنٹ ڈائریکٹر آئی ٹی اسفندیار کے ہیں جن کا تعلق چارسدہ کے علاقے مندنی سے ہے۔ دوہزار بارہ سے انھوں نے دن رات محنت کر کے پولیس نظام کو جدید خطوط پر استوار کرنے کے لئے Digitalization کا کام شروع کردیا تھا۔افسران بالا کی بھرپور تعاون ورہنمائی نے آپ کا کام اور بھی آسان بنا دیا ، یہی وجہ ہے کہ بقول اسفندیار، آج پختونخوا پولیس ای پولیسنگ میں کسی سے پیچھے نہیں۔ IVS,VVS,CRVS اور Hotspot Policing چندآلات کا نام نہیں، اس نے پولیسنگ کا پورا نظریہ تبدیل کردیا ہے۔آج IVS کے ذریعے مشکوک افراد، VVS کے ذریعے مشکوک یا چوری کی گاڑیوں اور CRVS کے ذریعے مجرموں کی شناخت منٹوں میں کی جاتی ہے ہاٹ سپاٹ پولیسنگ کے ذریعے جدید ٹیکنالوجی کی مدد سے ان مقامات کی نشاندہی کی جاتی ہے جہاں مخصوص جرائم یا دہشت گردی کے واقعات کثرت سے ہوتے ہیں اس کے بعد سائنسی طریقہ کار کے مطابق کسی محدود علاقے میں مخصوص جرائم کی وجوہات کا تجزیہ کیا جاتا ہے اور پھر اس کی سدباب کی مربوط کوششیں۔ اور ظاہر ہے کہ یہ سب تنہا محکمہ پولیس کے لئے ممکن نہیں بلکہ اس میں نادرہ اور ایکسائز اینڈ ٹیکسیشن کا ڈیٹا بیس اور تمام انٹیلی جنس ایجنسیوں کا آپس میں بھرپور تعاون بنیادی کردار ادا کررہا ہے۔

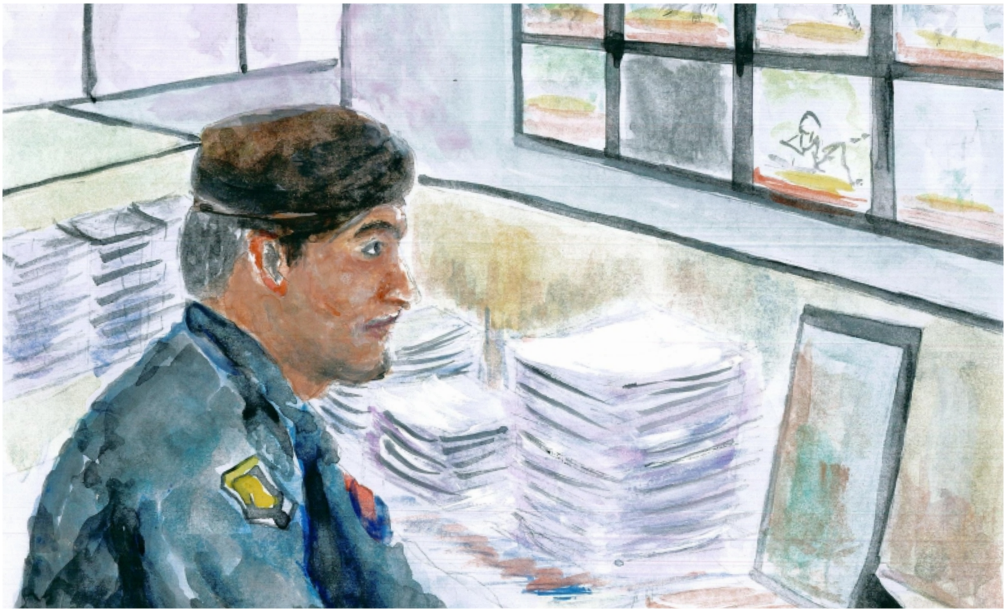

اسفندیار نے بتایا کہ ہم نے سنٹرل پولیس لائن میں جدید Data Analysis Control Room قائم کیا ہے جہاں سے

نہایت آسانی کے ساتھ پورے پشاور میں آن لائن FIR سمیت پولیس کی تمام کارکردگی کی مانیٹرنگ کی جاتی ہے۔اس کے علاوہ CCTV کیمروں کی جانچ کے لئے بھی الگ کنٹرول روم بنا ہوا ہے۔جہاں سے شہر کے تمام اہم مقامات پر نظر رکھی جاتی ہے۔ سی پی او میں صرف تیرہ افراد پر مشتمل عملہ اس پورے جدید نظام کی نگرانی کرتا ہے جبکہ ہر تھانے میں چار تربیت یافتہ افراد آئی ٹی ٹیم کا حصہ ہیں۔

جدید ٹیکنالوجی کے ذریعے کرپشن کی روک تھام میں مدد کے حوالے سے اسفندیار کا کہنا تھا کہ ٹریفک پولیس وارڈن کو Spy Pen کیمرے ، مختلف چوکوں میں CCTV کیمرے اور سٹی پٹرولنگ گاڑیوں میں ایسے کیمروں کی تنصیب جو گاڑی میں موجوداور گاڑی کے سامنے تمام لوگوں کی نقل وحرکت کو ریکارڈ کر سکے، یہ ایسے اقدامات ہیں جس سے رشوت لینا اگر ناممکن نہیں تو انتہائی مشکل ضرور ہو گیا ہے۔اسفندیار کی خواہش ہے کہ پولیس نظام میں مزید اصلاحات اور انفارمیشن ٹیکنالوجی کی اہمیت کے پیش نظر ایک مکمل آئی ٹی ڈیپارٹمنٹ کو قائم کیا جائے، جہاں ایک محفوظ اور سیکیور ڈیٹا سنٹر ہو۔اسفندیار کا کہنا ہے کہ اگر افسران بالا کا تعاون اسی طرح جاری رہا تو انشاءاللہ بہت جلد ہم اپنی یہ منزل بھی حاصل کر لینگے۔

اسم با مسمی، رافعہ قسیم بیگ

پشاور کی باسی ڈبل ماسٹر ڈگری ہولڈر رافعہ قسیم بیگ دسمبر دو ہزار نو میں پشاور پولیس میں بحیثیت کانسٹیبل بھرتی ہوئیں، ابھی ان کی باقاعدہ ٹریننگ کا آغاز بھی نہیں ہوا تھا کہ پشاور کے مضافاتی علاقے متنئی میں دہشت گردوں کے خلاف پولیس آپریشنز شروع ہوئے، وطن کی حفاظت کے احساس اور خطروں سے کھیلنے کی شوقین رافعہ بیگ نے محاذ جنگ پر جانے کے لئے اپنی خدمات پیش کیں۔ ان کے افسران نے ان کے جذبے کو دیکھتے ہوئے انہیں جانے کی اجازت دے دی، جہاں انھوں نے دہشت گردوں کے خلاف جنگ میں باقاعدہ حصہ لیا اور مخصوص تربیت کے بغیر میدان جنگ میں مشین گن استعمال کر کے اپنی خداداد صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ وہ دن اور آج کا دن رافعہ بیگ کی خواہش ہے کہ وہ کچھ کر کے دکھائے اور اپنی خداداد صلاحیت اور محنت سے نام کمائے۔ اسی شوق کی تکمیل کے لئے رافعہ بیگ نے دسمبر دو ہزار سولہ میں بم ڈسپوزل کی پندرہ روزہ تربیت حاصل کر کے ایشیاء کی پہلی خاتون بم ڈسپوزر کا اعزاز حاصل کیا، مگر ان کی ایڈونچرازم کا شوق انہیں آرام سے بیٹھنے نہیں دیتا ہے، اسی لئے باقاعدہ ڈیوٹی نہ ہونے کے باوجود اپنی تربیت کے اگلے ہی روز وہ رضا کارانہ طور پر اس ٹیم میں شامل ہوگیں جو ورسک روڈ پر بم کی موجودگی کی اطلاع پر جائے وقوعہ پر جا رہی تھی۔

رافعہ بیگ کی اعلی تعلیم، باہنر نے کے سلیقے، بحیثیت خاتون بم ناکارہ بنانے کی اولین تربیت اور کچھ عملی کرنے کے شوق نے انہیں میڈیا کے لئے ہاٹ کیک بنا دیا اور ان کی شہرت چار دام پھیل گئی، مقامی، قومی اور بین الاقوامی اخبارات میں ان کی تعریفی خبریں شہ سرخیوں میں شائع ہوئی، الیکٹرانک میڈیا نے نہ صرف ان پر تفصیلی رپورٹس بنائی بلکہ انہیں وی آئی پیز کی طرح ٹاک شوز میں مدعو کیا گیا۔

رافعہ بیگ کا کہنا ہے کہ ان کی صلاحیتوں کو مدنظر رکھ کر مختلف قومی و بین الاقوامی سرکاری و غیر سرکاری اداروں کی جانب سے انہیں نوکریوں کی پیشکش کی گئی ہے، مگر تا حال وہ اسی نوکری کو ترجیح دے رہی ہیں۔

ایک سوال کے جواب میں رافعہ بیگ کا کہنا تھا کہ MA, (I.R), MA, Economics, LLB(Part II) اور انگلش، اردو، پشتو، فارسی سمیت ہندکو پر عبور نے انہیں اپنے محکمے میں کوئی مالی فائدہ نہیں دیا۔ رافعہ بیگ نے شکوہ کیا کہ انھوں نے موٹر وے پولیس، ایف آئی اے اور ہائی کورٹ میں مختلف عہدوں کے لئے ٹیسٹ کوالیفائی کیا، مگر نامعلوم وجوہات کیوجہ سے انہیں موقع نہیں دیا گیا۔ اپنی خواہش کے حوالے سے رافعہ بیگ کا کہنا تھا کہ CSS کر کے ایک ذمہ دار افسر کی حیثیت سے پولیس فورس ہی میری اولین ترجیح ہے مگر نا گزیر گھریلوں مجبوریاں مجھے سی ایس ایس کی تیاری کا موقع نہیں دیتی ہے۔ مگر اس کے باوجود میں پولیس فورس میں رہ کر نہ

صرف نام کماوں گی بلکہ یہ ثابت کروں گی کہ پاکستانی خواتین کسی بھی میدان میں باقی دنیا کی خواتین سے پیچھے نہیں۔

نوٹ۔رافعہ بیگ کچھ عرصہ قبل فیڈرل پبلک سروس کمیشن کا امتحان پاس کر کے انٹی نارکوٹکس فورس خیبر پختونخوا میں بحثیت انسپکٹر بھرتی ہوئی ہے۔اوراس فورس میں بھی پہلی خاتون ایس ایچ او کے طور پر کام کر رہی ہے۔

خطروں کے کھلاڑی - زاہد خان

یوں تو کسی بھی فورس میں کام کرنا خطرات سے خالی نہیں ہوتا ہے مگر پاکستان میں بعض مقامات پر یا بعض شعبوں میں ڈیوٹی انجام دینا یقیناً جان پر کھیلنے کے مترادف ہوتا ہے۔ان میں سے ایک شعبہ بم ڈسپوزل یونٹ (BDU) بھی ہے اوراس میں کام کرنے والے وہ لوگ ہوتے ہیں جو جان کی پراہ کئے بغیر دوسروں کی جان بچانے کے لئے بارود سے کھیلتے ہیں اور بارود سے کھیلنا بچوں کا کھیل نہیں کیونکہ اس میں انسان کا سب سے قیمتی اثاثہ (اپنی جان) ہر وقت داو پر لگی ہوتی ہے۔

پختونخوا پولیس کے اسی خطرناک شعبے میں گزشتہ دس سال سے کام کرنے والے زاہد خان کا تعلق ملاکنڈ ایجنسی سے ہے جنہوں نے گزشتہ دس سال کے دوران پشاور، سوات اور ٹانک سمیت پختونخوا کے مختلف علاقوں میں 400 سے زیادہ بم ناکارہ بنائے، چھبیس خودکش جیکٹ اور گیارہ ہلاک ہونے والے بمباروں کے جیکٹ ناکارہ بنانا اس کے علاوہ ہے۔صرف تصور کیجئے کہ خدانخواستہ اگر ان چارسو بموں اور بارودی مواد میں سے دو سو بھی کامیابی سے ناکارہ بنانے کی بجائے پھٹ جاتے تو پختونخوا میں دہشت گردی کے شہدا اور زخمیوں کی تعداد آج کئی گنا زیادہ ہوتی۔

زاہد خان کا کہنا ہے کہ اپنے دس سالہ کیرئیر میں صرف ایک موقع ایسا آیا کہ میں اپنا ٹارگٹ حاصل کرتے ہوئے کافی خوفزدہ تھا اور یہ وہ وقت تھا جب 2011 میں پولیس نے پشاور کے مضافات میں ایک خودکش بمبار کو زندہ گھیرے میں لے لیا تھا۔ایمرجنسی کال پر جب میں موقع پر پہنچا، دیکھا تو پولیس نے گھیرا بنایا ہوا ہے، ہر ایک کی انگلی مشین گن کی ٹریگر پر ہے،اورسب پریشانی کی حالت میں صرف

ایک گیارہ سالہ نوجوان پر نظریں جمائے ہوئے ہیں جو ان کے درمیان زمین پر اوندھے منہ پڑا ہے۔ جب میں نے دیکھا کہ قمیض کے کنارے سے اس کی خودکش جیکٹ نظر آرہی ہے اور اسے صرف بندوق کی زور پر لیٹنے پر مجبور کیا گیا ہے تو میں نے اپنے افسران کی جانب دیکھا اور کہا سر، اسے گولی مارنا ہی بہتر حل ہے، مگر SP صاحب نے کہا کہ نہیں اسے زندہ گرفتار کرنا ہے۔

میری معلومات کے مطابق ایشیاء کی تاریخ میں اس سے پہلے کوئی ایسی مثال نہیں تھی کہ کسی جیکٹ پہنے ہوئے خودکش بمبار کو زندہ گرفتار کیا گیا ہو۔ مگر مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق، افسران کی ہدایت پر میں نے حفاظتی تدابیر مکمل کی، کلمہ شہادت پڑھی اور آہستہ آہستہ خودکش بمبار کی طرف بڑھنے لگا، میں نے ان سے گپ شپ کے انداز میں گفتگو شروع کی، پہلے تو وہ چپ رہا، لیکن جب میں ان کے قریب پہنچا تو وہ بھی جواب دینے لگا۔ میں نے اسے باتوں میں لگایا اور بہت احتیاط کے ساتھ اس کی قمیص اتار دی تا کہ بارودی جیکٹ کو ناکارہ بنا سکوں، وہاں موجود درجنوں لوگ سانس روکے دم بخود تھے درجنوں ٹی وی کیمرے منظر کشی کر رہے تھے، اور متعدد چینل اس پورے منظر کو براہ راست نشر کر رہے تھے، گھروں میں بیٹھے لاکھوں لوگوں کو شاید یہ کوئی فلمی منظر لگ رہا ہو گا مگر مجھ سمیت وہاں موجود اکثر لوگوں کو ڈر تھا کہ شاید بچہ تعاون کر کے ہمیں قریب آنے کا موقع دے رہا ہے تا کہ وہ ہمارا زیادہ سے زیادہ جانی نقصان کر سکے۔ میں دل ہی دل میں کلمہ شہادت اور زبان پر اس سے گفتگو کرتے ہوئے اس کی جیکٹ کے مطلوبہ تار ڈھونڈتا رہا اور کچھ ہی دیر میں، میں اس کی بارودی جیکٹ کو ڈیفیوز کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ تاریں کاٹ کر میں نے اس کی جیکٹ اتاری اور اس کو پولیس کے حوالے کر دیا۔ معلوم تاریخ میں شاید میں پہلا شخص ہوں جس نے عوام کے ساتھ ساتھ کسی خودکش بمبار کی زندگی بھی بچالی ہو۔

زاہد خان نے بتایا کہ سینکڑوں بموں کو ناکارہ بناتے ہوئے تین مرتبہ ایسا بھی ہوا ہے کہ بم ناکارہ بننے کی بجائے پھٹ گئے ہیں لیکن دنیا میں ابھی دانہ پانی باقی ہے اس لئے والدین سمیت عوام کی دعاؤں اور حفاظتی انتظامات کی بدولت آج تک زندہ اور محفوظ ہوں۔ دو اور مواقع پر بھی میری زندگی نے جیسے موت کو شکست دے دی ہو۔ 2010 میں ایک مرتبہ جنوبی ضلع ٹانک میں ڈیوٹی کے دوران میں سادہ کپڑے پہن کر سڑک کے کنارے نصب بم ڈھونڈ رہا تھا کہ طالبان نے شک کی بناء پر پکڑ لیا، میں نے بہانہ بنایا کہ میں محکمہ ٹیلی فون کا لائن مین ہوں اور خراب لائن ڈھونڈ رہا ہوں، کافی دیر سوچ بچار کے بعد واپس زندہ چھوڑ دیا۔

ایک اور موقع پر متنئی کے علاقے میں تاک میں بیٹھے ماہر دہشت گرد شوٹر نے مجھ پر فائرنگ کر دی، یہاں بھی میری قسمت اور حفاظتی اقدامات کام آئے اور میں آج تک زندہ ہوں۔

اس سوال کے جواب میں کہ آپ زیادہ خطرہ کس وقت محسوس کرتے ہیں، زاہد خان نے بتایا کہ بعض اوقات جب میں کوئی بم ناکارہ بناتا ہوں تو وہاں موجود عام لوگ جذبات میں آ کر محبت میں مجھے کندھوں پر اٹھاتے ہیں اور نعرے لگاتے ہیں۔ وہاں موجود پولیس والوں سمیت عام لوگ خوشی مناتے ہیں مجھے اسی وقت دھڑکا لگا رہتا ہے کہ خدانخواستہ اس موقع سے کوئی فائدہ نہ اٹھائے۔

کیا خیال ہے زاہد خان کی حقیقی کہانی کسی دیومالائی ناول یا ہالی ووڈ کی سسپنس فلم سے کم ہے؟ یقیناً نہیں۔ ہماری دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ بے گناہ عوام کی زندگیاں بچانے کے لئے ان کی زندگی دراز فرمائے۔ آمین

تین بہنیں تین کمانڈو تین سہیلیاں

کمانڈو کا نام زبان پر آتے ہی ذہن میں کسی سخت جان ہٹے کٹے جوان کی تصویر گھومنے لگتی ہے، ساتھ ہی ان کے لئے دل میں محبت اور احترام کا جذبہ بھی سر اٹھاتا ہے کیونکہ یہی وہ لوگ ہیں جو اس وقت مقابلے کے لئے سامنے آکر اپنی زندگی داو پر لگاتے ہیں جب عوام سمیت باقی فورسز کے لئے کوئی معرکہ سر کرنا ناممکن بن جاتا ہے۔اکیسویں صدی میں پختونخوا میں دہشت گردی کے چیلینجز سے نمٹنے کے لئے اگر ایک طرف مرد پولیس اہلکاروں کو بہترین تربیت اور جدید اسلحے سے لیس کرنے کا عمل جاری ہے تو دوسری طرف دل گردے کی مالک ایسی درجنوں خواتین بھی سامنے آئی ہیں جو سخت جان کمانڈو بننے کے تمام تر مراحل کامیابی سے مکمل کر کے دہشت گردوں کے لئے آہنی دیوار بن گئی ہیں۔انہی خواتین میں پختونخوا کے جنوبی ضلع کرک سے تعلق رکھنے والی تین بہنیں پری، ثمینہ اور رخسانہ بھی شامل ہیں جو گزشتہ تقریبا آٹھ سال سے پختونخوا پولیس میں خدمات انجام دے رہی ہیں۔ پری نے بتایا کہ وہ نو بہنیں تھیں اور ان کا کوئی بھائی نہیں تھا،

اس لئے ہم تینوں نے مل کر ملک وقوم کے لئے کچھ ایسا کرنے کا تہیہ کیا کہ نہ صرف ہماری والدین کو بیٹے کی کمی محسوس نہ ہو، وہ ہم پر بیٹوں جیسا فخر کر سکیں بلکہ ملک وقوم بھی ہمیں اچھے الفاظ میں یاد رکھیں۔اسی مقصد کو سامنے رکھتے ہوئے ہم تینوں نے پولیس میں شمولیت اختیار کی، نو مہینے کی رنگروٹ کورس کامیابی سے مکمل کیا، کچھ عرصہ ڈیوٹی کی مگر ابھی مزید کچھ کرنے اور کچھ بننے کی خواہش نے سر اٹھایا۔ ہماری خوش قسمتی تھی کہ پولیس اصلاحات کے تحت سپیشلائزڈ سکولوں نے کام شروع کیا جس میں کمانڈو بننے کا ایلیٹ ٹریننگ سکول بھی شامل تھا۔ہم تینوں نے فیصلہ کیا کہ اگر والدین کو بیٹے کی طرح سرخرو کرانا ہے تو پھر ہمیں کمانڈو بننا ہوگا اور اسی طرح ہم نے خود کو رضا کارانہ طور پر ایلیٹ کمانڈو بننے کے سخت ترین تربیتی مراحل سے گزارنے کے لئے پیش کر دیا۔سات مہینے کی دشوار ٹریننگ کے بعد دو ہزار پندرہ میں کمانڈو بن کر آئیں تو اپنی خود اعتمادی نے نئی پہچان دی۔حال ہی میں تینوں نے ایک ساتھ بم ڈسپوزر کی تربیت حاصل کر کے اپنی صلاحیتوں کو مزید نکھار دیا۔

تینوں بہنیں گریجویٹ ہیں، سی ٹی سرٹیفیکیٹ ہولڈرز ہیں، برسرروزگار ہیں، ماہر کمانڈو ہیں، بہترین بم ڈسپوزر ہیں، مگر ابھی مزید بہت کچھ سیکھنے اور بہت کچھ کرنے کے لئے بے تاب۔ یقیناً ایسی ہی بیٹیاں ملک وقوم کا قیمتی سرمایہ ہوتی ہے اور نہ صرف اپنے والدین کے لئے بلکہ پوری قوم کے لئے باعث فخر بھی۔

اولسی پولیس پروگرام نے زندگی کا دھارا بدل دیا ۔ باجی

مئی دو ہزار سولہ میں سی آر ایس ایس کا اولسی پولیس ریڈیو پروگرام ضلع پشاور اور مردان کی طرح چارسدہ میں بھی شروع ہوا، چارسدہ میں پہلا پروگرام ہونے کیوجہ سے میں خود پروگرام کی میزبانی کر رہا تھا، دو پولیس افسران اور ایک مقامی صحافی ریڈیو شو میں میرے مہمان تھے۔ چونکہ یہاں سے اس پراجیکٹ کا یہ پہلا پروگرام تھا اس لئے میں نے کافی تفصیل کے ساتھ پروگرام سمیت پورے پراجیکٹ کے اغراض ومقاصد بیان کئے کہ اس کا بنیادی مقصد پولیس اور عوام کے درمیان فاصلوں کو مٹانا اور اعتماد کو بڑھانا ہے۔

ابھی میں نے مہمانوں کے ساتھ گفتگو شروع ہی کی تھی کہ ایک خاتون کی کال آئی، میں نے حسب معمول پوچھا کہ کون اور کہاں سے بات کر رہی ہیں، خاتون نے کہا کہ میں باجی بات کر رہی ہوں، اس کے بعد انھوں نے پروگرام کے اغراض ومقاصد کی بھرپور تعریف کی اور ایسے پروگراموں کو وقت کا تقاضا قرار دیا۔ مثل مشہور ہے کہ اندھے کو کیا چاہیے دو آنکھیں، ریڈیو کے پہلے پروگرام کی ابتدا میں اتنے اچھے فیڈ بیک نے مجھے مسرور کر دیا۔ وہ دن اور آج کا دن باجی نہ صرف اولسی پولیس پروگرام کی باقاعدہ سامع اور کالر ہیں بلکہ انھوں نے ہماری ٹیم سے بڑھ کر عوام اور پولیس کو ایک دوسرے کے قریب لانے میں اپنا کردار ادا کیا۔ وہ نہ صرف ہماری مشاورتی گروپ کی فعال ممبر بن گیں بلکہ شاید وہ واحد خاتون ممبر تھیں جنھوں نے نہ صرف ورکنگ گروپ کے تمام اجلاسوں میں شرکت کی بلکہ چارسدہ میں منعقدہ چاروں پبلک فورمز سمیت بعض ریڈیو پروگراموں میں بھی بروقت شرکت کر کے اپنا کردار بخوبی نبھایا۔ وہ ہر اس موقع پر پولیس کی حمایت اور عوام کو اپنی ذمہ داری کا احساس دلانے کے لئے مضبوط دلائل اور الفاظ کے ساتھ سامنے آئیں جب ناقدین پولیس پر بے تحاشا الزامات کے تیر برسا رہے تھے۔ انھوں نے مختلف اوقات میں ثابت کیا کہ انھوں نے اولسی پولیس کے اغراض ومقاصد کو دل کی گہرائیوں سے قبول کر لیا ہے اور اس میں رضا کارانہ طور پر اپنے حصے کا کردار نبھانا اپنا مقصد حیات بنا لیا ہے۔

اولسی پولیس کے تیسرے پبلک فورم میں جب یہ بات سامنے آئی کہ چارسدہ ڈی آرسی میں خاتون ممبر کی عدم دستیابی کیوجہ سے مقامی خواتین کو مشکلات کا سامنا ہے تو یہاں بھی جرات و بھادری سے کام لیتے ہوئے باجی نے ڈی آرسی میں کام کرنے کے لئے اپنی خدمات رضا کارانہ طور پر پیش کردیں جسے ڈی آئی جی اعجاز خان اور ڈی پی او سہیل خالد نے بخوشی قبول کیا۔

ثمینہ افتخار کا تعلق ضلع چارسدہ کے علاقہ ترناب سے ہے اپنی دیانت داری، ثالثانہ طبیعت اور آس پڑوس کی خواتین کے کام آنے کی وجہ سے باجی کے نام سے مشہور ہیں، انتہائی کم تعلیم کے باوجود اللہ تعالی نے باجی کو جس فہم وفراست سے نوازا ہے بہت سے ڈگری ہولڈر بھی اس سے کوسوں دور ہوتے ہیں۔

اولسی پولیس کے آخری ورکنگ گروپ اجلاس میں ان کا کہنا تھا کہ اولسی پولیس پروگرام نے ان کی زندگی کا دھارا بدل دیا اب وہ ایک مقصد کے ساتھ جڑ گئی ہیں گزشتہ تین مہینے سے ڈی آرسی میں خواتین کے مسائل حل کر رہی ہے، مگر ساتھ ہی انھوں نے اولسی پولیس پراجیکٹ کو توسیع دینے کی ضرورت پر زور دیا، کیونکہ بقول ان کے ابھی ان کی طرح مزید ہزاروں باجیوں کو پولیس کے ساتھ تعاون کرنے اور عوام کی مدد کرنے پر آمادہ کرنا باقی ہے۔

حسنا خان کی خواہش

حسنا خان گزشتہ سات سال سے چارسدہ پولیس میں بحثییت کانسٹیبل خدمات انجام دے رہی ہیں۔ اسلامیات میں ماسٹر ڈگری کرنے والی حسنا خان کا کہنا ہے کہ پہلے ان کی خواہش تھی کہ وہ بھی علاقے کی باقی خواتین کی طرح محکمہ تعلیم میں نوکری حاصل کریں، پولیس فورس میری دوسری ترجیح تھی مگر اب گزشتہ سات سال پولیس میں رہنے، اس کی خوبیاں اور خامیاں دیکھنے، ٹریننگ حاصل کرنے اور بی ون پاس کرنے کے بعد میں اسی محکمے میں ترقی کرنا اور نام کمانا چاہتی ہوں، کیونکہ میرے خیال میں اس پورے خطے کی ان پڑھ گھریلوں خواتین کے کام آنے کے لئے پولیس سے بہتر کوئی محکمہ نہیں۔ میری خواہش ہے کہ میں مزید تعلیم اور ٹریننگ حاصل کر کے ترقی کروں اور خاندانی مسائل اور گھریلوں جھگڑوں کی شکار خواتین کی مدد و رہنمائی کرسکوں۔

حسنا خان نے دو ہزار دس میں محکمہ پولیس میں شمولیت اختیار کی، نو مہینے کا ابتدائی کورس کامیابی سے مکمل کیا، اس کے علاوہ سول ڈیفنس کا کورس اور بی ون امتحان بھی پاس کیا، چھ سال تک ناکہ بندیوں، چھاپوں، عدالتوں، تھانوں، وی آئی پیز اور انوسٹی گیشن سمیت وہ تمام فرائض بخوبی نبھائے جو ایک مرد کانسٹیبل بھی بمشکل نبھاتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ کامیابی ان کی والدہ اور بھائیوں کے بھرپور تعاون اور اعتماد میں مضمر ہے، حسنا خان نے کہا کہ ابتدا میں مردوں کے درمیان کام کرنا انتہائی مشکل تھا مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کافی عادی ہوگئی۔ جبکہ عام لوگوں کی جانب سے بحثییت پولیس کانسٹیبل لحاظ رکھنے اور عزت سے پیش آنے نے بھی کافی حوصلہ افزائی کی۔ انھوں نے کہا کہ اب پولیس میں باقی محکموں کی طرح تمام بنیادی سہولیات میسر ہیں تعلیم یافتہ لوگوں کی کمی نہیں جس کی وجہ سے ان کے رویوں میں بھی بہتری آرہی ہے۔ لہذا عام لوگوں، خصوصا خواتین کو پولیس میں شمولیت اختیار کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرنا چاہیے۔

انھوں نے اولسی پولیس پروگراموں کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ اس کے ذریعے مجھے اپنی بات ہزاروں لوگوں تک پہنچانے کا موقع ملا، جس کے لئے میں سی آر ایس ایس کی مشکور ہوں۔

ایک عالم باعمل - پروفیسر غلام رحمانی

خوبصورت سفید داڑھی، اچھے نقوش، سر پر سفید ٹوپی ، ہاتھوں میں تسبیح، پاوں میں جاگرز، سادہ شلوار قمیص میں ملبوس پروفیسر غلام رحمانی سے روزانہ میرا آمنا سامنا اس وقت ہوتا ہے جب میں نماز فجر کے بعد نیند پوری کرنے کے لئے گھر جارہا ہوتا ہوں۔ وہ اکثر مجھے روک کر ساتھ واک کرنے کی نصیحت کرتے ہیں مگر میں ہر دفعہ ہنس کر ٹال دیتا ہوں کیونکہ میں نہ تو اپنی صبح کی نیند کی اس بری عادت سے چھٹکارہ پاسکتا ہوں، نہ ہی ان کے ساتھ پانچ چھ کلومیٹر واک کرسکتا ہوں۔

چارسدہ کے علاقے زیارت کلی میں پیدا ہونے والے پروفیسر غلام رحمانی انتہائی اہم انتظامی اور تدریسی عہدوں پر رہنے اور بیس گریڈ میں ریٹائرڈ ہونے کے باوجود انکساری میں اپنی مثال آپ ہے۔ ایم اے اسلامیات اور ایم اے عربی کرنے والے غلام رحمانی نے مقابلے کا امتحان (سی ایس ایس) پاس کیا، مگر محکمہ خزانہ میں ملنے والی پوسٹ صرف اس وجہ سے قبول نہیں کی کہ اس میں حرام کی کمائی کا خدشہ تھا۔ انھوں نے بحیثیت لیکچرار گورنمنٹ کالج تیمر گرہ سے اپنے کیریئر کا آغاز کیا۔ کچھ عرصے بعد ایم فل میں داخلہ لیا مگر اپنے محکمے نے انہیں مزید تعلیم کے لئے چھٹی دینے سے انکار کردیا۔

اپنے کیریئر کے دوران وہ اسسٹنٹ کنٹرولر تعلیمی بورڈ ایبٹ آباد، اسسٹنٹ سیکرٹری تعلیمی بورڈ سوات، سیکشن آفیسر محکمہ تعلیم خیبر پختونخوا پشاور، ڈپٹی سیکرٹری محکمہ اعلیٰ تعلیم خیبر پختونخوا، اسسٹنٹ پروفیسر، ایسوسی ایٹ پروفیسر اور آخر میں پروفیسر کے عہدوں پر تعینات رہے۔ جہاں نہ صرف انہیں بہت کچھ کرنے کا موقع ملا بلکہ اگر وہ چاہتے تو لاکھوں کروڑوں کما بھی سکتے تھے، لیکن انتہائی اہم تدریسی وانتظامی عہدوں پر رہنے اور بیس گریڈ سے ریٹائرڈ ہونے کے باوجود درویش صفت غلام رحمانی آج بھی اپنی چار لاکھ کی سوزوکی گاڑی خود ڈرائیو کرتے ہیں، مگر انتہائی خوش وخرم اور مطمئن زندگی گزارتے ہیں۔

پروفیسر غلام رحمانی کا کہنا ہے کہ دو چیزوں کو میں اپنے کیرئیر کے اہم ترین کام اور کامیابی سمجھتا ہوں، ایک ہائر ایجوکیشن ریگولیٹری اتھارٹی کا قیام اور دوسرا اسسٹنٹ پروفیسر کو بھرتی کے فورا بعد تین مہینے کی لازمی محکمانہ ٹریننگ کی ابتدا۔

نظام تعلیم کی خامیوں کا ذکر کرتے ہوئے غلام رحمانی کا کہنا تھا کہ انتظامی پوسٹوں پر ناتجربہ کار افراد کی تعیناتی، میرٹ کے بغیر اساتذہ کی بھرتی اور تربیت کے بغیر صرف تعلیم پر توجہ بنیادی مسائل ہیں جن کا سدباب ہونا چاہیے۔نوجوان طلباء کے نام اپنے پیغام میں پروفیسر رحمانی کا کہنا تھا کہ اگر وہ ایک ہی بات پر عمل کریں تو کوئی ایک مسائل خودبخود حل ہونگے اور وہ یہ کہ تعلیمی اداروں میں سیاست سیکھنی ہے کرنی نہیں۔

ضمیر کی آواز۔ارشد منان یوسفزئی

1967 میں مردان میں پیدا ہونے والے ارشد منان یوسفزئی نے مردان سے انٹر پاس کرنے کے بعد پنجاب یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور 1991 میں ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی۔ نوجوان ڈگری ہولڈر ارشد منان واپس مردان آئے اور نیک خواہشات کے ساتھ مقامی عدالتوں میں وکالت کی پریکٹس شروع کردی لیکن صرف ایک سال پریکٹس کرنے کے بعد انہیں احساس ہوا کہ یہاں تو ظالم اور مظلوم کی کوئی تمیز نہیں۔صرف پیسے لیکر کیس جیتنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا جاتا ہے۔آپ کا موکل ظالم ہو یا مظلوم، مدعی ہو یا مدعا علیہ، حتی کہ وہ کوئی اغوا کار، ڈاکو یا سمگلر ہی کیوں نہ ہو، اگر وہ وکیل کو بھاری بھر کم فیس دے سکتا ہے تو اپنی تمام تر تعلیم، تجربے اور صلاحیت استعمال کر کے ان کو بے گناہ ثابت کرنا وکیل پر فرض ہو جاتا ہے۔یہ ایک زمینی حقیقت ہے جو قیام پاکستان سے لیکر آج تک ملک بھر میں جاری و ساری ہے مگر ارشد منان کی زندہ ضمیر نے انہیں اس کمیونٹی کا حصہ بننے پر ملامت کرنا شروع کیا جو مظلوم کی حمایت کرنے کی بجائے پیسے کی خاطر ظالم کو بھی بے گناہ ثابت کرنے پر مجبور ہو۔کچھ لیت و لعل اور سوچ بچار کے بعد انھوں نے ضمیر کی آواز پر لبیک کہا اور وکالت کے پیشے کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خیر آباد کہہ دیا۔

انھوں نے اپنی ڈگری بھلا کر والد کے چائے کے کاروبار میں ان کا ہاتھ بٹانا شروع کیا۔والد کی وفات کے بعد کاروبار کا بٹوارہ ہوا، مگر ارشد منان نے کسی اور کام یا نوکری میں طبع آزمائی کی بجائے اسی کاروبار کو اپنا پیشہ بنالیا۔کیونکہ ذاتی کاروبار میں بندہ ظلم زیادتی کرنے پر مجبور نہیں ہوتا ہے، ثانیا یہ کہ اس میں سے وقت نکال کر ارشد منان نے سماجی اور فلاحی کاموں میں حصہ لینا شروع کیا اور دوہزار پانچ میں مردان کے نامی گرامی سماجی شخصیت سید کمال شاہ باچا کے ساتھ مل کر فلاحی تنظیم (صوبائی امن جرگہ) کی بنیاد رکھی۔ اس تنظیم کے اغراض و مقاصد میں اغوا برائے تاوان، کارلفٹنگ، پرائیویٹ سود اور شادی کے نام پر کم سن بچیوں کی خرید و فروخت کی روک تھام کے لئے کوششیں شامل ہیں۔ ارشد منان نے بتایا کہ آج بارہ سال بعد صوبہ کے تقریبا تمام اضلاع میں صوبائی امن جرگہ کی شاخیں کام کر رہی ہیں، پرائیوٹ سود کے خلاف ہماری مسلسل جدوجہد رنگ لے آئی اور صوبائی حکومت نے چند ماہ قبل اسکی روک تھام کے لئے قانون سازی کر کے اہم قدم اٹھالیا۔اغوا برائے تاوان اور ہر ظلم کے خلاف ہم پولیس کے ساتھ ہیں، نہ صرف یہ کہ انکو اطلاع دیتے ہیں، ان کی حمایت کرتے ہیں بلکہ جہاں ضرورت ہو، ہم مظلوم کی حمایت کے لئے اپنے رضا کار بھی بھیج دیتے ہیں۔اسی قسم کی ایک کامیاب کاروائی تقریبا تین سال قبل ہم نے اس وقت کی، جب مردان کے علاقے لوندخوڑ میں سجاول نامی ایک غریب کیلا فروش کی بیٹی علاقے کے با اثر اور اوباش نوجوان فواد نے اغوا کرلی، اور چند دن ساتھ رکھنے کے بعد اسے قتل کر دیا۔راضی نامے سے انکار پر انکے والدین کے گھر پر حملہ

کیا اوران کی والدہ کو بھی قتل کیا۔ہم نے پولیس کی حمایت کے لئے مسلح رضا کار فورس بنائی اور علاقے میں جا کر ان لوگوں کو گرفتاری دینے پر مجبور کیا۔

ارشد منان کی نیک نامی اور سماجی خدمات کو دیکھتے ہوئے پولیس نے انہیں ڈی آر سی کا ممبر بنا دیا۔ان کا کہنا ہے کہ گزشتہ تقریبا ڈیڑھ سال کے دوران وہ ڈی آر سی میں لائے گئے دوسو سے زیادہ تنازعات کامیابی سے حل کر چکے ہیں اور یہ سلسلہ ابھی جاری ہے۔آپ کی اسی کارکردگی کو مدنظر رکھتے ہوئے سی آر ایس ایس نے انہیں اولسی پولیس ورکنگ گروپ کا ممبر بنایا، جہاں آپ نے تمام اجلاسوں کے علاوہ اولسی پولیس کے متعدد ریڈیو اور ٹی وی پروگرام میں بھی حصہ لیا اور صوبے میں قانون کی عملداری یقینی بنانے میں ہماری معاونت کی۔

ارشد منان یوسفزئی کا کہنا ہے کہ اللہ تعالی نے ہمیں انسانیت کی فلاح و بہبود کے لئے پیدا کیا ہے، جو لوگ یہ کام کرینگے انہیں دنیا و آخرت دونوں میں کامیابی ملے گی، جو نہیں کرینگے ان کی کامیابی کی کوئی ضمانت نہیں۔

شہیدوں کا وارث ۔ غازی محمد فیاض ، ڈی ایس پی

سن 2000 میں ASI بھرتی ہونے کے بعد آج تک مجھے کوئی ایسا مقابلہ یاد نہیں جو میرے علاقے میں ہوا ہو، اور جس میں براہ راست میں نے شرکت نہ کی ہو۔ اب ظاہر ہے کہ اٹھارہ سال میں ہونے والے آپریشنز اور مقابلوں کی تعداد مجھے یاد نہیں مگر یہ سینکڑوں میں ہیں۔ دہشت گردی کے خلاف جنگ کو میں قومی جنگ کے ساتھ ساتھ ذاتی جنگ اس لئے سمجھتا ہوں کیونکہ بحثییت پولیس آفیسر اس قوم کی حفاظت ہماری ذمہ داری ہے۔ یہ خیالات شہیدوں کے وارث اور خود دہشت گردوں کے ساتھ مقابلے میں زخمی ہوکر غازی بننے والے DSP محمد فیاض کے ہیں جن کا تعلق مردان سے ہے۔ محمد فیاض پشاور چارسدہ اور صوابی میں مختلف عہدوں پر تعینات رہے، محکمہ پولیس کے اندر دہشت گردی کے خلاف فرنٹ مین کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں، آپ کے والد امیر بہادر بھی پولیس میں ASI کی حیثیت سے کام کررہے تھے جو بیالیس سال قبل 1975 میں مفروروں کے ساتھ مقابلے میں شہید ہوگئے تھے، والد کی شہادت کے بعد بڑے بھائی محمد اسرار پولیس میں بھرتی ہوئے اور ترقی کرتے ہوئے SHO بڈھ بیر تعینات ہوئے۔ وطن کی حفاظت اور مجرموں کا سد باب اپنے والد سے ورثے میں ملا تھا اس لئے 1994 میں اپنے والد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے انھوں نے بھی جام شہادت نوش کیا۔ ان کی شہادت کے چھ سال بعد محمد فیاض پولیس میں بھرتی ہوئے وہ دن اور آج کا دن، محمد فیاض اپنے والد اور بھائی کا مشن آگے بڑھانے میں مصروف عمل ہیں، دہشت گردوں اور مجرموں کے خلاف متعدد مقابلوں میں کئی مرتبہ تو آپ بال بال بچ گئے، مگر 10 مارچ 2015 کو صوابی میں دہشت گردوں کے ساتھ مقابلے میں آپ شدید زخمی ہوگئے، تین ماہ تک ہسپتال میں زیر علاج رہے، ہسپتال سے فارغ ہوئے تو حوصلہ ہارنے کی بجائے ایک نئے عزم کے ساتھ دہشت گردوں کے خلاف میدان میں آگئے۔ ایک طرف آپ کے ہاتھ کی ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کا علاج آج تک جاری ہے مگر دوسری طرف وہ آج بھی مقابلوں اور آپریشنز میں حصہ لینے سے باز نہیں آتے۔

اپنی خواہش کے حوالے سے ڈی ایس پی فیاض کا کہنا تھا کہ علاقے میں امن میری واحد خواہش ہے، یہ جب بھی پورا ہوا میں سمجھوں گا کہ میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔ انھوں نے کہا کہ اس دنیا میں کسی کے کام آجاوں، انسانیت کی خدمت کر سکوں، یہی میری آرزو ہے اور اس کے بدلے مجھے صرف دعاوں کی ضرورت ہے۔

کرپشن کے ماحول میں انٹی کرپشن آفیسر، شفیع اللہ گنڈاپور

شفیع اللہ گنڈاپور کے دادا سردار عطاء اللہ خان قیام پاکستان سے قبل علی گڑھ یونیورسٹی کے گریجویٹ تھے اسی تعلیم یافتہ خاندان کے چشم و چراغ شفیع اللہ گنڈاپور نے MA, LLB کی ڈگریاں حاصل کی اور 1995 میں صوبائی پبلک سروس کمیشن کا امتحان پاس کر کے پختونخوا پولیس میں بحثیت ASI بھرتی ہوئے۔ اپرسکول کورس کے بعد سن 2000 میں ترقی کی اس کے بعد پانچ سال تک ڈی آئی خان کے مختلف تھانوں میں SHO کی حیثیت سے خدمات انجام دی۔ انسپکٹر بن کر محکمہ انسداد بدعنوانی (انٹی کرپشن) میں سرکل آفیسر تعینات ہوئے، یہاں آ کر جیسے شفیع اللہ کی صلاحیتیں نکھر گئی۔ انھوں نے اپنے سرکل کے بڑے بڑے مچھلیوں پر ہاتھ ڈال کر نام کمایا۔ جس میں اس وقت کے تحصیل ناظم ڈی آئی خان بھی شامل تھے۔ اسی کارکردگی کی بدولت اپنے آپ کو UN Police Course کا اہل ثابت کیا جس میں پورے پاکستان سے صرف دو افسران ناروے کے لئے منتخب ہوئے تھے۔ دو ہزار دس میں اسلام آباد میں منعقدہ امتحان پاس کر کے UN Peace Mission کے لئے مشرقی تیمور میں خدمات انجام دینے کے لئے منتخب ہوئے، پندرہ مہینے تک مشرقی تیمور میں پاکستان کی بہترین نمائندگی کی، اور اقوام متحدہ سمیت مشرقی تیمور کی حکومت سے بھی میڈل حاصل کئے۔

مشرقی تیمور سے واپس آئے تو افسران بالا نے انٹی کرپشن میں آپ کی سابقہ کارکردگی کو مدنظر رکھ کرایک مرتبہ پھر اسی محکمے میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر تعینات کر دیا، آپ نے کرپشن کی روک تھام کے لئے اپنی جدوجہد کو مزید تیز کیا اور پہلے ہی سال پورے پختونخوا میں بہترین ریکوری آفیسر قرار پائے۔ شفیع اللہ گنڈاپور نے اپنی شبانہ روز محنت دیانت اور لگن سے اپنی ترقی اور کامیابیوں کی رفتار کم نہیں ہونے دی، اکتوبر 2015 میں شفیع اللہ گنڈاپور پاکستان بھر سے محکمہ انٹی کرپشن کے پہلے آفیسر تھے جنہیں چار مزید پاکستانیوں سمیت International AntiCorruption Academy Luxembourg (Austria) کے دورے کے لئے چن لیا گیا۔ ایک سال تک مردان میں ایس ایس پی آپریشن کے اہم ترین عہدے پر تعینات رہے، اس کے بعد ایس ایس پی انوسٹی گیشن کے طور پر کام کیا اور آج کل ایس پی رورل پشاور کی حیثیت سے تعینات ہے۔ مردان اور ڈی آئی خان سمیت پورے پختونخوا میں شفیع اللہ گنڈاپور کو ان کی دیانت اور محنت کیوجہ سے قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

ایک سوال کے جواب میں شفیع اللہ گنڈاپور کا کہنا تھا کہ آئین وقانون کی رو سے ہم تمام سرکاری ملازمین Public Servant ہیں اور Public Servant کا نہ اپنا کوئی اختیار ہوتا ہے نہ کوئی خواہش، ان کی صرف ذمہ داری ہوتی ہے اور میری کوشش ہے کہ میں اپنی ذمہ داریوں کے ساتھ انصاف کرسکوں۔

پولیس والے کی سماجی زندگی نہیں ہوتی ۔ DSP فضل واحد

مجھے اپنے جماعت دہم کے اردو کتاب میں شامل بابائے اردو مولوی عبدالحق کا لکھا ہوا وہ جملہ آج تک یاد ہے، لکھتے ہیں (صرف بادشاہوں اور شہنشاہوں کے قصے لکھنے کے قابل نہیں ہوتے بلکہ غریب مزدوروں اور نچلے درجے کے ملازمین میں بھی ایسے ایسے نایاب ہیرے پائے جاتے ہیں جن کی زندگی کی کہانی سبق آموز ہوسکتی ہے اور جو اپنی دیانت اور خودداری کی بدولت بادشاہوں سے زیادہ شان وشوکت کی زندگی گزار رہے ہوتے ہیں۔ مولوی عبدالحق نے یہ جملہ اس وقت کی انگریز فوج کے ایک معمولی مگر خوددار اردلی نورخان کے لئے لکھا تھا، لیکن میرے خیال میں یہی جملہ آج کے دور میں صرف انٹر تک محدود تعلیم حاصل کرنے کے باوجود ڈی ایس پی جیسے ذمہ دار اور سینئر پوزیشن پر کام کرنے والے فضل واحد کے لئے بھی غلط نہ ہوگا جنہوں نے صرف میٹرک تعلیم کے ساتھ ایک عام کانسٹیبل کی حیثیت سے اپنے کیریئر کا آغاز کیا اور آج اپنی محنت اور دیانت کی بدولت پختونخوا پولیس میں ایک نیک نام ڈی ایس پی کی حیثیت سے کام کررہے ہیں۔ فضل واحد کا تعلق ملاکنڈ ایجنسی سے ہے اپنی بھرتی کے کچھ عرصہ بعد ہی انہیں CID پوسٹ کردیا گیا جہاں انھوں نے پانچ سال تک خدمات انجام دی۔ لوئر کورس کے بعد ترقی کر کے ایڈیشنل محرر بنے۔ 1994 میں مردان میں مفروروں کے ساتھ بڑے مقابلے میں بہترین کارکردگی پر تعریفی سند اور نقد انعام کے علاوہ As Special Case انٹرمیڈیٹ کورس کے لئے بھیج دئے گئے۔ 2006 میں پشاور کے علاقے سربند میں دہشت گردوں کے ساتھ مقابلے میں بہادری کے وہ جوہر دکھائے کہ افسران کی نگاہ سے پوشیدہ نہیں رہے اور انہیں کنفرم ASI کے عہدے پر ترقی دے دی گئی۔ اپر کورس کرنے کے بعد مختلف تھانوں میں SHO کی حیثیت سے خدمات انجام دی، اور افسران سمیت عوام سے بھی داد و تحسین حاصل کی۔ دو ہزار بارہ میں ایکٹنگ جبکہ دو ہزار سولہ میں ریگولر DSP کے عہدے پر ترقی دے دی گئی۔

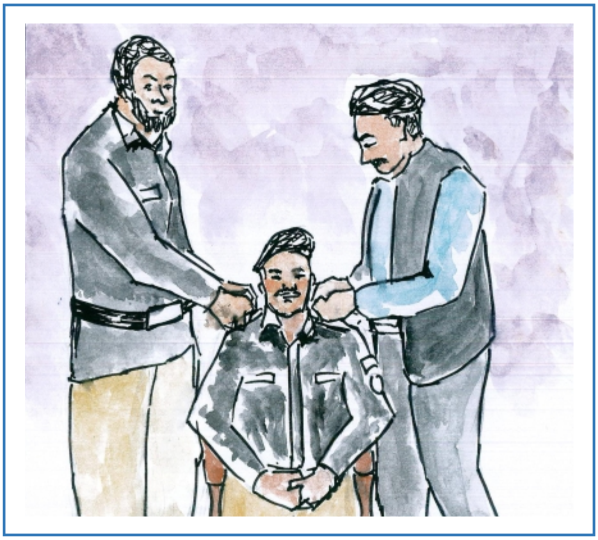

فضل واحد کا کہنا ہے کہ ترقی کا واحد زینہ محنت اور دیانت ہے جو کبھی رائیگاں نہیں جاتی ہے۔ محکمہ پولیس میں درپیش مشکلات کے حوالے سے فضل واحد کا کہنا ہے کہ پولیس مین کی کوئی سماجی اور خاندانی زندگی نہیں ہوتی ہے کیونکہ وہ چوبیس گھنٹے آن ڈیوٹی ہوتا ہے۔ دس پندرہ دن بعد بمشکل گھر جانے کا موقع ملتا ہے لیکن گھر میں بھی ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ کس وقت ایمرجنسی میں واپس ڈیوٹی پر آنے کا بلاوہ آتا ہے۔ اپنی خواہش کے حوالے سے فضل واحد کا کہنا تھا کہ امن کی بحالی اور ریٹائرمنٹ کے بعد بیوی بچوں کے ساتھ پرسکون زندگی گزارنا میرا خواب ہے اور انشاءاللہ یہ خواب بہت جلد شرمندہ تعبیر ہوگا۔

SHO اعجاز کی کہانی یا ایڈونچر فلم

یہ دو ستمبر دو ہزار سولہ کو صبح پونے چھ بجے کا وقت تھا، میں نائٹ ڈیوٹی کے بعد تھکا ہارا جوں ہی اپنے تھانے (متھرا) پہنچا تو ایمرجنسی کال کے ذریعے اطلاع ملی کہ دہشت گردوں نے ورسک میں کرسچن کالونی پر حملہ کر دیا ہے۔ میں چونکہ نفری سمیت پہلے سے باوردی اور مسلح تھا، علی الصبح ہونے کیوجہ سے سڑک پر کوئی رش نہیں تھا، اس لئے ہمیں متھرا سے کرسچن کالونی پہنچنے میں بمشکل سات سے آٹھ منٹ لگے ہونگے۔ جب ہم کالونی کے گیٹ پر پہنچے تو شدید فائرنگ جاری تھی، یہ چونکہ آرمی کا علاقہ ہے، اس لئے آرمی کے جوانوں نے پوری کالونی کو باہر سے گھیرے میں لے لیا تھا۔ ہمیں بتایا گیا کہ چار دہشت گردوں کی فائرنگ سے گیٹ پر موجود دو سیکیورٹی اہلکار زخمی اور ایک سویلین رہائشی جاں بحق ہوا ہے۔ میں نے کسی تامل کے بغیر اسی گیٹ سے اندر داخل ہونے کا فیصلہ کیا جس پر اندر سے شدید فائرنگ ہو رہی تھی۔ ابھی میں اپنے سپاہیوں کے ساتھ چند قدم ہی آگے بڑھا تھا کہ میرا ایک گن مین سجاد ہاتھ پر گولی لگنے سے زخمی ہوگیا۔ میں نے اوٹ لیکر اس کے زخم پر کپڑا باندھا اور سجاد سمیت باقی گن مینوں کو بھی ادھر ہی رہ کر چوکس رہنے کا حکم دیا اور خود کلمہ شہادت پڑھ کر فائرنگ کرتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ چند ہی لمحوں میں تھوڑے سے فاصلے پر کھڑے خودکش بمبار سے میری آنکھیں چار ہوئیں۔ اس سے پہلے کہ وہ کلاشنکوف میری طرف گھماتا میں نے وہاں موجود ریت کے ٹیلے کی طرف چھلانگ لگاتے ہوئے ٹریگر دبا دیا۔ گولی لگنے سے اس کی خودکش جیکٹ زوردار دھماکے سے پھٹ گئی۔ اگر ریت کا وہ ٹیلہ درمیان میں نہ ہوتا تو شاید اُس کے ساتھ ساتھ میرے بھی پرخچے اڑ چکے ہوتے۔

اس کے بعد میں آگے بڑھ گیا کیونکہ وہاں ایک زیر تعمیر عمارت سے مسلسل فائرنگ ہو رہی تھی۔ اتنی دیر میں فوجی جوان بھی ایک دوسری عمارت کی چھت پر چڑھنے میں کامیاب ہوگئے، ہم سب نے مل کر زیر تعمیر عمارت میں موجود دہشت گردوں کے خلاف کارروائی شروع

کی، ہماری شدید فائرنگ اور ہینڈ گرنیڈ اندر پھینکنے سے دو زوردار دھماکے ہوئے۔ ہم سمجھ گئے کہ دو مزید خودکش بھی اڑ گئے ہیں۔ لیکن ایک بمبار ابھی باقی تھا اور وہ حالات کا فائدہ اٹھا کر رہائشی کوارٹر میں گھسنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ لیکن ہماری خوش قسمتی تھی کہ فائرنگ شروع ہوتے ہی کالونی کے زیادہ تر رہائشی پناہ لینے کے لئے وہاں موجود چرچ میں جمع ہو گئے تھے۔ چوتھا دہشت گرد اس رہائشی کوارٹر سے مسلسل فائرنگ کر رہا تھا۔ ہم اس کے ساتھ مقابلے میں بہت احتیاط سے کام لے رہے تھے کیونکہ ہمیں یہ معلوم نہیں تھا کہ اس کوارٹر کے رہائشی لوگ یہاں موجود ہیں یا نہیں۔ تقریباً چالیس منٹ تک مقابلے کے بعد کوارٹر سے زوردار دھماکے کی آواز آئی۔ اور اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔

وقفے وقفے سے ہم نے دونوں عمارتوں کو ایک مرتبہ پھر بھی نشانہ بنایا، لیکن اندر سے کوئی جواب نہیں آیا۔ کچھ دیر کے لئے پوری کالونی میں خاموشی چھا گئی، صرف چرچ سے بچوں کی رونے کی آوزیں آرہی تھیں۔ میں نے زیر تعمیر عمارت کے اندر گھستے ہوئے احتیاطاً ایک برسٹ ماری، لیکن دوسری طرف سے خاموشی برقرار رہی، اندر جا کر دیکھا تو دونوں خودکش بمباروں کے اعضاء بکھرے پڑے تھے۔ میں نے ان کے ساتھ پڑا ہوا اسلحہ اکھٹا کیا اور کلیرنس دے کر باقی نفری کو بھی اندر بلا لیا۔ اس کے بعد پوری کالونی کی کلیرنس کرا دی گئی اور افسران بالا کو بھی اندر بلا لیا گیا۔ ہماری بروقت اور دلیرانہ کارروائی سے تقریباً دو سو افراد کی جانیں بچ گئی تھیں۔ اس لئے وہ خوشی سے بے حال ہو رہے تھے۔ افسران کے آتے ہی کالونی کے باسیوں سمیت فوجی جوانوں نے میری تعریفوں کے پل باندھ دیے، کمانڈنٹ سوات سکاوٹ اور آئی جی ایف سی نے اسی وقت مجھے ایک لاکھ روپے نقد انعام سے نوازا۔ بعد میں آئی جی پولیس نے بھی تعریفی سند اور نقد انعام دیا۔ جبکہ 10 دسمبر 2016 کو صدر پاکستان جناب ممنون حسین نے ایوان صدر میں اپنے ہاتھ سے National Human Rights Award دیکر میری حوصلہ افزائی کی۔ اسی کارکردگی کی بنیاد پر مجھے قائداعظم پولیس میڈل کے لئے بھی نامزد کیا گیا ہے۔ جس کا حتمی فیصلہ ہونا ابھی باقی ہے۔

یہ اس وقت نوجوان SHO متھرہ محمد اعجاز خان کی صرف ایک دلیرانہ کارروائی کی روداد ہے، جس کی زندگی اس قسم کی داستانوں سے بھری پڑی ہے۔ محمد اعجاز کا تعلق صوابی کے علاقے کالوخان سے ہے۔ جو 2006 میں کانسٹیبل کی حیثیت سے بھرتی ہوئے مگر صرف نو مہینے ریکروٹ لانگ کورس اور دو سالہ نوکری کے بعد شوق نے مجبور کیا اور 2009 میں PCS کا امتحان پاس کر کے ASI بھرتی ہو گئے انھوں نے صوابی اور پشاور کے مختلف تھانوں میں مختلف عہدوں پر کام کیا۔ محمد اعجاز نے دہشت گردی کے خلاف سکوارڈ (ATS) میں کام کرتے ہوئے اپنی کامیابی کی ایک اور داستان کچھ یوں بیان کی۔

2013 میں پشاور ماڈل سکول کے آٹھ سالہ طالب علم اویس کو نامعلوم افراد نے اغوا کر کے جلال آباد میں پندرہ لاکھ روپے میں بیچ دیا تھا۔ بچہ خریدنے والے اس کے والدین سے سات کروڑ روپے تاوان کا مطالبہ کر رہے تھے۔ افسران بالا نے کیس میرے حوالے کیا، میں نے دن رات ایک کر کے کھوج لگایا اور چند ہی دن میں اصل اغوا کاروں کو چارسدہ اور صوابی سے گرفتار کر لیا۔ اس کی نشاندہی پر جلال آباد میں بچہ خریدنے والے مجرموں کے پشاور میں رہائش پذیر رشتہ داروں کو گرفتار کیا اور اسی کے ذریعے افغانستان میں مجرموں کو اس بات پر مجبور کیا کہ انھوں نے بغیر کسی تاوان کے بچے کو پاکستانی سفارتخانے کے حوالے کر دیا۔

اپنے کیریئر کی مشکل گھڑی کے حوالے سے محمد اعجاز نے بتایا کہ 2015 میں ارمڑ کے علاقے میں دہشت گردوں سے مقابلے کے دوران میرے تین ساتھی یکے بعد دیگرے شہید ہوگئے۔ اگرچہ ہم بھی اسی وقت قاتل کو مارنے میں کامیاب ہوگئے۔ مگر ساتھیوں کی شہادت کا وہ دکھ اور تکلیف میں آج تک نہیں بھول سکا ہوں۔

اعجاز خان کی خواہش ہے کہ پولیس کی ایسی عزت بحال ہوجائے جس طرح بیرون ملک لوگ اپنی پولیس کی کرتے ہیں اور وہ اس وقت تک زندہ رہیں کہ اپنے بچوں کو بھی پولیس میں بھرتی کروا سکے۔

پولیس حقوق العباد کا ذریعہ، ثمینہ ظفر بخاری

1996میں پولیس میں کانسٹیبل کی حیثیت سے بھرتی ہونے والی ثمینہ ظفر بخاری آج DSP کی حیثیت سے کام کررہی ہے۔ان کا کہنا ہے کہ تمام تر اختیارات اور ذمہ داریوں کے باوجود میں نے گھر اور دفتر کے کاموں میں توازن برقرار رکھا ہے ۔گھر میں کوئی ملازم نہیں،صبح دفتر جانے سے پہلے بچوں کو ناشتہ دے کر اور تیار کر کے سکول بھیجتی ہوں، برتن دھوتی ہوں، گھر کی صفائی کرتی ہوں کیونکہ یہاں میں ایک خاتون خانہ ہوتی ہوں۔اس کے بعد خود تیار ہوکر وردی پہن کر DSP بن جاتی ہوں اور دفتر روانہ ہوتی ہوں۔ صبح سے شام تک وہ تمام کام کرتی ہوں جو ایک مرد پولیس آفیسر کرتا ہے۔ بلکہ اب بیس سال بعد تو دفتر میں مجھے اپنا آپ بھی مرد لگنے لگا ہے۔کیونکہ اب میں نے وہ تمام مردانہ صفات اپنالی ہے جو ایک پولیس آفیسر کے لئے ضروری ہوتی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ پہلے میں فالو کرتی تھی اب میں لیڈ کرتی ہوں۔اب کم از کم مجھے یہ سمجھ آگئی ہے کہ یہ دنیا رونے والوں کا نہیں ہنسنے والوں کا ساتھ دیتی ہے، یہی وجہ ہے کہ میں نے مشکلات پر عورتوں کی طرح رونا چھوڑ دیا ہے۔ ہر مشکل کو خندہ پیشانی سے برداشت کرتی ہوں بلکہ سوچ سمجھ کر اس کا حل بھی نکالتی ہوں۔

یہ ہری پور سے تعلق رکھنے والی پولیس DSP ثمینہ ظفر بخاری کے خیالات ہیں جو 1996 میں گھریلوں حالات سے مجبور ہو کر کالج طالبہ سے پولیس کانسٹیبل بن گئی تھی ذہین اور محنتی اتنی کہ سہالہ ٹریننگ سکول میں فرسٹ ریکروٹ کورس میں پورے پاکستان کو ٹاپ کیا، بعد کے چھ چھ مہینے کے دو اور ساڑھے تین مہینے کے ایڈوانس کورس میں بھی کامیابی کا تسلسل قائم رکھا۔

Incharge Rescue 15, IO Investigation, Incharge Complaint Cell, SHO (Women Police Station), Reader, Law Instructor Naib Court, جیسے عہدوں پر کام کرتے ہوئے آپ نے زندگی کا ہر رنگ اور محکمہ پولیس کا ہر رخ دیکھ لیا۔ثمینہ ظفر کا کہنا ہے کہ ابتدا میں کئی لوگوں نے مجھے پھنسانے، ورغلانے اور سبز باغ دکھانے کی کوشش کی، مگر میں اپنے والدین کی تربیت اور دعاوں کی طفیل اپنا دامن بچانے میں کامیاب رہی۔ اور آج نہ صرف میں خود بلکہ میرا خاندان اور محکمہ بھی میری پاک دامنی سمیت کرپشن سے بچنے پر فخر محسوس کرتا ہے۔والدین کی دعاوں کے بعد جس چیز نے مجھے زندگی بھر سپورٹ کیا وہ PSP افسران کی شفقت اور سرپرستی تھی۔ ان افسران کو اللہ تعالی نے یہ صلاحیت دی ہوئی ہوتی ہیں کہ وہ دو باتوں ہی میں بندے کو تاڑ لیتے ہیں کہ کس قبیل کا بندہ ہے، میرے بیس سالہ کیرئیر میں اپنی محنت اور لگن کے ساتھ ساتھ انہی شفیق افسران کی بدولت آج میں اے پلس ACR کیساتھ کامیابی کے منازل طے کر رہی ہوں۔

اپنی خواہش کے حوالے سے ثمینہ ظفر کا کہنا تھا کہ میں جب بھی اللہ تعالی سے مانگتی ہوں یہی مانگتی ہوں کہ میں بے کس اور مظلوموں کی مدد کر سکوں، انھوں نے کہا۔ اللہ تعالی اگر چاہے تو اپنے حقوق بندے کو معاف کر دیتا ہے مگر بندوں کے حقوق کبھی معاف نہیں کرتا۔ اور اگر ہم چاہیں کہ ہم دوسروں کے حقوق زیادہ سے زیادہ ادا کرے اور انسانیت کی بھلائی کا کام کرے تو اس کے لئے محکمہ پولیس سے بہتر کوئی جگہ نہیں کیونکہ ہم سے رجوع کرنے والوں کی اکثریت مظلوموں کی ہوتی ہے۔ اگر کوئی پولیس آفیسر زندگی بھر دو چار مظلوموں کی دادرسی کر کے ان کی دعاوں کا حقدار ٹھرے تو یہی دنیا و آخرت دونوں کی کامیابی کے لئے کافی ہے۔

پولیس عوام سے اور عوام پولیس سے ہیں ۔ سجاد حسین

دھیمے لہجے میں بات کرنے والے انتہائی کم گو DSP تنگی سجاد حسین کا تعلق نوشہرہ سے ہے۔ سائنس میں ماسٹر ڈگری کرنے والے سجاد حسین کی طبیعت دانشورانہ اور شاعرانہ ہے۔ اپنے کام سے کام رکھنے والے یہ جوان 1998 میں ASI کی حیثیت سے پولیس میں بھرتی ہوئے، گزشتہ انیس سال کے دوران پشاور چارسدہ اور نوشہرہ میں مختلف عہدوں پر تعینات رہے۔ اپنے کیرئیر میں چھ سال کا طویل عرصہ یو این مشن میں ملک سے باہر (کوسوو) میں گزارا، جہاں آپ نے اگر ایک طرف بین الاقوامی پولیسنگ کی خدمات انجام دی تو دوسری جانب عالمی معیار کی پولیس تربیت کے مواقع سے بھی بھرپور فائدہ اٹھایا اور Police Ethics، Response to Global Terrorism, Investigation جیسی موضوعات پر بہترین تربیت حاصل کی۔ آج انہی موضوعات پر پولیس کے سپیشلائزڈ سکولوں میں علم کو عام کرتے ہوئے لیکچر دے رہے ہیں۔

سجاد حسین اگر ایک طرف اپنے عالمی تجربات کی روشنی میں خود کو تبدیل کر کے اپنے سٹاف کو تبدیل کرنے کی کوششوں میں مصروف ہے تو دوسری جانب CRSS کے اولسی پولیس پراجیکٹ کے ساتھ ایک سالہ وابستگی بھی آپ کے قول وفعل میں نمایا تبدیلی لائی ہے۔ اولذکر تجربات نے آپ کو سمجھا دیا ہے کہ پولیس کی ڈیوٹی میں Take it Easy والا انداز ہمیشہ نقصان کا باعث بنتا ہے۔ اور انٹیلی جنس اطلاعات کی صورت میں Level of Alertness بڑھانے سے نقصانات کو کم سے کم کیا جاسکتا ہے۔ انہی مثبت اور پیشہ ورانہ عادات اور ہدایات کی بدولت آپ کی سٹاف نے فروری 2016 میں چارسدہ کے تحصیل تنگی میں کچہری پر ہونے والے تین خودکش بمباروں کے حملے کو مکمل طور پر ناکام بنا دیا، کیونکہ انٹیلی جنس اطلاعات کے بعد آپ نے سیکیورٹی بڑھادی تھی اور جوانوں کو ہر وقت الرٹ رہنے اور فوری کارروائی کا حکم دیا تھا جس کی بدولت تینوں خودکش بمباروں کو اپنے ٹارگٹ پر پہنچنے نہیں دیا گیا اور وہ پولیس کو کوئی بھی جانی نقصان پہنچائے بغیر، خود کو اڑانے پر مجبور ہو گئے۔

جبکہ ثانیاالذکر یعنی اولسی پولیس نے آپ کے ذہن کے دھارے کو بدل دیا ہے۔آپ کا کہنا ہے کہ اب میری کوشش اور خواہش یہی ہے کہ Community Policing کو بڑھایا جائے کیونکہ عوام کی تعاون اور مدد کے بغیر پرامن معاشرے کے قیام کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہوسکتا۔سجاد حسین کا کہنا تھا کہ ابتدا میں مجھے اولسی پولیس پروگراموں کی اہمیت کا اندازہ نہیں تھا،مگر چند ایک ریڈیو پروگراموں اور مشاورتی اجلاسوں میں شرکت کا جو Feedback مجھے ملا، مجھے یقین ہوگیا کہ یہی پروگرام آگہی اور تبدیلی کا بہترین ذریعہ ہیں۔سی آر ایس ایس نے اولسی پولیس پراجیکٹ کے ذریعے عوام کو جو شعور دیا اور اب وہ اپنے حقوق اور پولیس سے تعاون کے لئے جس طرح آگے آتے ہیں ماضی میں اس کی مثال نہیں ملتی۔

About CRSS

CRSS Background

The Center for Research and Security Studies (CRSS) is a think tank/advocacy center founded in September, 2007. Founded by noted security expert and media personality Imtiaz Gul, it is committed to the cause of independent research and nonpartisan analysis, and informed advocacy, and help people outside Pakistan understand this nation of 212 million people.

As an advocacy center, CRSS is dedicated to trigger critical thinking through discourse anchored in global democratic values such as socio-political diversity, rule of law, equal citizenry, and acceptance of diversity, fundamental human rights, all at the intersection of empirical research in security studies.

CRSS Core Values

CRSS strives to embed the national conversation in constitutionalism, and rationalize it over extremism and sectarianism. CRSS believes the path to peace is through embodying fundamental human rights, specifically:

– strict adherence to the rule of law, and stringent implementation
– informing the public on civic education, especially good governance and public accountability
– promoting equal rights for all citizens of Pakistan
– championing women empowerment
– providing training and opportunities to youth to veer them away from radicalization through critical thinking

CRSS' programming reflects its core values, which CRSS believes can, along with time-tested methodologies in strategic communications, impactful message development, research and advocacy result in a more tolerant and cohesive Pakistan.

CRSS Publications

CRSS produces several publications annually. Our flagship publications are the NAP Tracker, an annual audit of the counter-terrorism/counter-extremism National Action Plan (NAP) of the Government of Pakistan; and the Annual Security Report, a measure of the state of security in Pakistan by gauging the number of violence-related casualties across the country.

In addition, our most recent publication was the Role of Madrassas, which provided answers to why parents continue to send their children to madrassas. CRSS also regularly publishes papers, commentary and analysis by our research fellows from around the world. You can find all of our publications freely online, or collect copies free of cost from our offices in Islamabad.

You can also visit the CRSS Blog, as well as the website of our sister organization Afghan Studies Center.

Center for Research & Security Studies

Islamabad Office:
Plot 14-M, Ali Plaza, 2nd Floor,
F-8 Markaz, Islamabad, Pakistan.
Tel: +92-51-8314801-03
Fax: +92-51-8314804

Peshawar Office:
Flat # 306, 3rd Floor, Badshah Tower,
Bara Road, Peshawar Cantt.
Tel: 091-5252311-12
Fax: 091-5252310

Email: mail@crss.pk, Web: www.crss.pk